# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| **لمعات:** تھیٹر کے جوکراور پاکستان | ادارہ | 3 |
| روزہ کے احکام | ادارہ | 4 |
| قرآنی نظریۂ قومیت | ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد | 9 |
| دابۃ الارض کی وضاحت | خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی | 20 |
| انتخاب لغات القرآن | ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد | 26 |
| جھوٹ اور حرام چھوڑ کر حلال رزق سے ملکی حالات ٹھیک ہونگے | غلام باری، مانچسٹر | 27 |
| اِختلافِ قرأت کا افسانہ | جمیل احمد عدیل، بورے والا | 31 |
| نقد ونظر | ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد | 57 |
| دیا جلائے رکھنا | ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی | 59 |


## حدیث نبوی ﷺ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے اور ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے اس کے ضرر کو اس سے رفع کرتا ہے اور اس کے پیچھے سے اس کی پاسبانی اور نگرانی کرتا ہے۔ (ابوداؤد، جامع ترمذی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمحات

## تھیٹر کے جوکر اور پاکستان

جب تھیٹر والوں کو ایک سین کے بعد، کسی ایسے سین کے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے اسٹیج میں کافی رد وبدل کرنا پڑے تو وہ اسٹیج کے سامنے پردہ ڈال دیتے ہیں اور پردے کے باہر جوکر (Jokers) بھیج دیتے ہیں جو ناظرین کی توجہ کو اپنی طرف جذب کئے رکھتے ہیں۔ نادان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اصل ڈرامہ کا حصہ ہے حالانکہ یہ محض اس لئے ہوتا ہے کہ تھیٹر والوں کو اتنا وقت مل جائے کہ وہ پس پردہ حسب منشاء تبدیلیاں کرسکیں جب وہ تبدیلیاں مکمل ہو جاتی ہیں تو جوکروں کا کھیل ختم ہو جاتا ہے اور پردہ اٹھ جاتا ہے۔

دورِ حاضرہ کی سیاسی اصطلاح میں ان جوکروں کو مختلف نام دیے جاتے ہیں۔ جب کسی شاطر حکومت/ اپوزیشن کو اپنی ابلیسی چال کے لئے کچھ وقت کی مہلت مطلوب ہوتی ہے تو وہ اپنے سیاسی اسٹیج پر پردہ گرا دیتی ہے اور پردے کے باہر ایک ''جوکر'' بھیج دیتی ہے جو دیکھنے والوں کی توجہ کو اس طرح اپنی طرف مبذول کئے رکھتا ہے کہ انہیں احساس ہی نہیں ہونے پاتا کہ پسِ پردہ کیا ہو رہا ہے جب پردے کے پیچھے تدبیر مکمل ہو جاتی ہے تو جوکر واپس چلے جاتے ہیں اور دیکھنے والے یہ دیکھ کر بھونچکے رہ جاتے ہیں کہ اس دوران میں اسٹیج کا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے مقامر ہیں پختہ کار بہت
نہ رنگ لائے کہیں تیرے ہاتھ کی خامی

اس لئے

گرچہ ہے دلکشا بہت، حسنِ ''فرنگ'' کی بہار
طائرکِ بلند بال، دانہ و دام سے گذر

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ پرچہ چھپنے تک شروع ہو چکا ہو گا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق) قرآن کی رو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

(1) **يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَo** (2:183)-

''اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرسکو۔''

(2) **ایام معدودات .....**

''یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں''۔

(3) **فمن كان منكم مريضا او علىٰ سفر فعدة من ايام اخر.**

''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے''۔

(4) **وعلىٰ الذين يطيقونه فدية طعام مسكين**

(5) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(6) **شهر رمضان الذى انزل فيه القران.....**

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(7) **فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيْضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** (2:183-185)-

''لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو.....تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے۔''

(8) وَكُلُواْ وَاشْرَبُواْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّواْ الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ (2:187)-

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(9) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَآئِكُمْ (2:187)-

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوگیا کہ:

1- روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)۔

2- روزے میں' اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے' دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

3- روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

4- اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے۔ لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم' شق نمبر۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

**غور فرمایئے!** اوپر کی چاروں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے **وعلی الذین یطیقونہ**' کا ترجمہ۔۔۔ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں۔۔۔ کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ۔۔۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔۔۔ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشاء یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ ''طاقت'' کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ 'طاقت' کا ترجمہ اردو کے لفظ 'طاقت' سے کر دیا۔ ان

دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم ص ۱۳۰۴میں ہے۔

''طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کرسکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔**لا تحملنا مالا طاقتلنا بہٖ** کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اس طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب ص 103 جلد 12 میں ہے کہ:

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار ص 155 جلد نمبر 2 میں فرماتے ہیں۔

**اطاقۃ** دراصل **مکنت** اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب **اطاق الشیئ** صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔یعنی دشواری کے ساتھ اسے برداشت کرسکتا ہو۔ چنانچہ **یطیقونہ** سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار (عُذر کی جمع) کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے..... اسی بناء پر امام راغبؔ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:

**طاقۃ** کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور **وعلی الذین یطیقونہ** سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں۔جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔(تفسیر کشاف، ص ۲۵۵، جلد ۱)۔

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

عربی زبان میں **الوسع** کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور **طاقۃ** کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔لہٰذا (آیۂ زیرِنظر) کے معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے.....۔ (روح المعانی، ص ۵۹، جلد ۲)۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ ''**طاقۃ**''کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر **وعلی الـذیـن یطیقونہ**' کا ترجمہ۔۔اور جولوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔۔کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ۔۔اور جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں...... کِیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرلے۔چنانچہ **وعـلـی الـذین یطیقونہ**' میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب ''جامع احکام القرآن''ص268۔ص269' جلد2 میں ہے کہ:

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمے کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ ابن عباسؓ۔قیس بن السائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمد اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔نیز ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی امِ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بمشقت روزے رکھ سکتے ہیں۔لہٰذا تیرے ذمے فدیہ ہے قضا نہیں۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> الذین یطیقونہ سے یہاں مراد بوڑھے' ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو......تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو۔روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت

کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔

(تفسیر المنار، ص ۱۵۵، ص ۱۵۷، جلد۲)۔

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے:

1- بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

2- حاملہ عورتیں۔

3- دودھ پلانے والی عورتیں۔

4- اپاہج اور معذور لوگ۔

5- پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔

6- ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (Constitutionaly) کمزور پیدا ہوئے ہوں۔

7- وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پرمشقت کاموں میں ہوتی ہے مثلاً کانوں میں کام کرنے والے، کارخانوں میں کام کرنے والے وغیرہ۔

8- وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے، اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ، آیات نمبر 183 تا 188)۔


# نظریۂ خیر

ادارہ طلوع اسلام کے چیئرمین ڈاکٹر انعام الحق صاحب کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بعنوان ''نظریۂ خیر، فلسفۂ اخلاق اور قرآن کی روشنی میں'' شائع ہو گیا ہے۔ یہ فکر انگیز تصنیف ادارہ طلوع اسلام 25 بی، گلبرگ 2، لاہور سے دستیاب ہے۔ 534 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/300 روپے ہے۔ 50 فی صد کی خصوصی رعایت کے بعد صرف -/150 روپے میں علاوہ ڈاک خرچ ادارہ طلوع اسلام سے دستیاب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

# قرآنی نظریۂ قومیت

**عنوانِ بالا کے تحت لکھا گیا مضمون 16 اگست 2009ء کو ایک تقریب میں پڑھا گیا جو کہ ادارہ طلوع اسلام کے تحت یومِ آزادی کے سلسلہ میں منعقد کی گئی۔ مضمون پڑھنے کے بعد سامعین کی طرف سے کئے جانے والے سوالات کے جوابات بھی محترم ڈاکٹر انعام الحق صاحب نے دیے۔ یہ مقالہ طلوع اسلام کے قارئین کے لئے درجِ ذیل کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)**

عزیزانِ گرامی قدر! السلام علیکم۔

میں بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا دلی ممنون ہوں کہ انہوں نے یومِ پاکستان کی اس باسٹھویں تقریب میں خصوصی طور پر خطاب کے لئے میرا انتخاب کیا۔ یہ میرے لئے بہت اعزاز اور فخر کی بات ہے۔ عزیزانِ گرامی قدر! یومِ پاکستان کی اس تقریب کے حوالے سے خطاب کے لئے ''قرآنی نظریۂ قومیت'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔

کسی حکیم نے بڑے پتہ کی بات کی تھی کہ آپس میں بات چیت کرنے سے پہلے جو الفاظ یا اصطلاحات موضوع گفتگو بنیں، ان کا مفہوم واضح ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مقرر اور سامعین کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ایک ہی مفہوم سے متفق ہوں۔ اس کے بغیر بات مزید آگے نہیں بڑھ سکتی۔

تحقیق کے طالب علم کو پڑھایا جاتا ہے کہ وہ اپنی تحریر یا تقریر میں جو الفاظ یا اصطلاحات استعمال کریں، وہ عصر حاضر کے ان مفہوم کو ادا کریں جو علمی حلقوں میں مستند ترین مانا جاتا ہو۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ میں اپنے خطاب کے عنوان کے تینوں الفاظ/ اصطلاحات کا مفہوم بیان کر کے اس میں آپ لوگوں کو شریک کروں۔

پہلے لفظ ''قرآنی'' سے فطرتی طور پر وہی مفہوم لیا گیا ہے جس کی وضاحت خود قرآن نے عربی مبین اور تصریفِ آیات کی رو سے کی ہے۔ دوسری اصطلاح نظریہ کا مفہوم علم کی زبان میں یوں درج ہے۔

(1) حقائق و واقعات، اشیاء و حوادث کو ایک مثالی اور عمومی زاویہ یا رشتہ میں دیکھنا۔

(2) سیاقِ علمی میں کسی مسئلہ سے متعلق معلومات کو ان کے مجرد علائق میں دیکھنا تاکہ مسئلہ کی تفہیم ہو سکے۔

(3) ایک مجرد ضابطہ، عمومی اصول، ماڈل جو کسی مظہر کی توجیہہ کے لئے قبول یا پیش کیا جائے۔

تیسری اصطلاح ''قومیت'' کی اصطلاح Nation بمعنی ملت، قوم سے مراد معاشرتی گروہ لیا جاتا ہے جو ثقافتی

لحاظ سے ہم رنگ ہو اور اسے اپنی نفسی زندگی اور اس کے اظہار کی وحدت کا پورا پورا شعور ہو۔ اس کے افراد کے کچھ رشتے قدرتی طور پر اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ وہ اکٹھے خوش کن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جدید نظریہ یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی ایک الگ ریاست بنانی چاہئے۔

پہلی تعریف قوم کے تناظر میں سامنے لائی گئی ہے جبکہ قومیت کی اصطلاح کا مفہوم یوں درج ہے۔

''روحانی جذبہ جو ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں نسل کا اشتراک ہو۔ وہ ایک ہی علاقے پر آباد ہوں۔ ان میں زبان' ادب' مذہب' ثقافت' تاریخ' روایات' مفادات' سیاسی روابط اور سیاسی وحدت کا اشتراک ہو۔

عزیزانِ گرامی قدر! ان اصطلاحات کے مفہوم کی وضاحت سے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے موضوع ''قرآنی نظریہ قومیت'' کی طرف لوٹ آئیں اور اس کے نظریہ پاکستان کے ساتھ تعلق پر روشنی ڈال سکیں۔ نظریہ پاکستان کے بارے میں محترم منیر صاحب (ریٹائرڈ) چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنی کتاب From Jinnah to Zia کے دوسرے ایڈیشن میں فرمایا ہے کہ قائداعظم پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ سیکولر کا لفظ شاید ہمارے کچھ احباب کے لئے غیر مانوس ہو۔ لہٰذا میں چاہوں گا کہ اس اصطلاح کا بھی علمی مفہوم سامنے لایا جائے۔ علم میں سیکولر (عصری) سے مراد ہے کہ

(1) لاطینی زبان میں لغوی طور پر جس کا تعلق وقت (تاریخ)' قبیلہ' نسل یا امور عالم سے ہو۔

(2) ایسے امور جن کا تعلق عصری زندگی سے ہو۔ سماجی امور و معاملات بمقابلہ پروہتانہ یا کلیسائی امور انتظامی۔

(3) وہ امور مثلاً تعلیم' اخلاق اور شہری یا مملکتی نظم و نسق جو کلیسائی انتظامیہ سے آزاد سمجھے جائیں۔

(4) ارض بمقابلہ ماورائی اور روحانی۔

(5) عام معنوں میں خلاف مذہب (دین)۔

جسٹس منیر کے پاکستان میں قائداعظم کا سیکولر ریاست کے قیام کے دعویٰ کو نظریہ پاکستان کی دونوں مقتدر ہستیوں نے واضح طور پر مسترد کیا ہوا ہے۔ علامہ اقبال کی وضاحت میں ہم ان کے ایک ہی مصرع کو سامنے لا رہے ہیں' جن میں انہوں نے فرمایا کہ:۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسی طرح ہم قائداعظم کے متعدد اقوال کے ذکر کرنے کی بجائے صرف ان کا ایک ہی جامع اور واضح قول درج کر رہے ہیں'

جوانہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) کے طلباء کو 1941ء میں انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کے دفاع میں کہا تھا کہ:

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم کے اس دوٹوک اور واضح موقف کے بعد کہ وہ مطالبہ پاکستان اس نظریہ سے کر رہے ہیں کہ وہاں وہ قرآنی نظام کا عملاً نفاذ کرواسکیں' ان سے منسوب بیان کہ وہ پاکستان میں سیکولر نظام کے داعی تھے اس کا متقاضی نہیں ہے کہ اس کو خاطر میں لاکر وقت کا ضیاع کیا جائے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ قائداعظم کا نظریہ پاکستان قرآنی نظریہ قومیت ہی پر مبنی تھا اور یہی ہمارے خطاب کا موضوع ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ قرآنی نظریہ قومیت کی غیر مبہم انداز میں واضح دوٹوک الفاظ میں وضاحت کی جائے۔ عزیزانِ گرامی قدر!

قرآن کے نظامِ حکومت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسان کو ایک قوم (عالمگیر برادری) قرار دیتا ہے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (2:213)- اس لئے وہ رنگ' نسل' زبان اور وطنیت کی بناء پر انسانوں کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کرنے کے خلاف ہے۔ وطنیت کی بناء پر تقسیم کو علامہ اقبال نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس کی یوں سرزنش کی ہے کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرھن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

قرآن نے تو نسل اور قبیلہ کے نام سے پکارے جانے کا مقصد سورہ الحجرات (49:13) میں چار الفاظ میں بیان کر دیا کہ ''جَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا'' خاندان یا قبیلے (جن کی بنیاد پر قوم کی تشکیل ہوتی ہے) سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو۔

قرآن ساری دنیا کو ایک ملک اور تمام انسانوں کو ایک وحدت بتاتا ہے اور ان میں تفریق کا صرف ایک ہی معیار قرار دیتا ہے یعنی نظریاتی فرق۔ بالفاظِ دیگر دنیا کے تمام وہ انسان جو وحی کی رو سے متعین کردہ مستقل اقدار کو زندگی کا نصب

العین قرار دیں' اس کے نزدیک ایک قوم کے افراد ہیں (خواہ دنیا کے کسی حصے کے رہنے والے اور کسی نسل سے متعلق ہوں) اور وہ لوگ جو اس نصب العین کے خلاف کوئی اور نصب العین قرار دیں' اس کے نزدیک وہ دوسری قوم کے افراد۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں کفر اور مومن کی تقسیم کہا جاتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنکُمْ کَافِرٌ وَمِنکُم مُّؤْمِنٌ (64:2)- اس (خدا) نے تمہیں انسانی پیکر عطا کیا۔ تم میں سے بعض کافر اور بعض مومن ہو جاتے ہیں ان دو گروہوں کے علاوہ اور کوئی معیارِ قومیت قرآن کی رو سے قابلِ قبول نہیں۔

قومیت کے تناظر میں پہلے گروہ کافر کا زندگی کے متعلق مختصر طور پر نظریہ ہے کہ انسان بھی (دیگر حیوانات کی طرح) صرف طبیعی جسم رکھتا ہے۔ اس کا جسم طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور کچھ وقت کے بعد' انہی قوانین کے مطابق اس کی مشینری رک جاتی ہے۔ اسے اس کی موت کہتے ہیں' جس سے فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس امر کی وضاحت ہمیں قرآن کریم سے بھی ملتی ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوا یَتَمَتَّعُونَ وَیَأْکُلُونَ کَمَا تَأْکُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ (47:12)- لیکن جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں (اور سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے) تو ان کی زندگی اور حیوانات کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ انہی کی طرح کھاتے پیتے' سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاتے (اور مر جاتے ہیں)۔ اس تصورِ زندگی کا نتیجہ (شرفِ انسانیت کی) تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس کے بالمقابل دوسرے گروہ مومنین کا نظریہ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس کے پاس جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جو حیوانات کو نہیں ملی' صرف انسان کو عطا ہوئی ہے۔ اسے انسانی ذات یا نفس کہتے ہیں۔ انسانی ذات نہ مادی ارتقاء کی پیداوار ہے اور نہ طبیعاتی قوانین کے تابع۔ یہ ہر انسانی بچہ کو خدا کی طرف سے پیدائش کے ساتھ عطا ہوتی ہے۔ انسانی ذات نشوونما یافتہ شکل میں نہیں ملتی بلکہ مضمر اور امکانی صورت میں ملتی ہے۔

انسانی ذات کی ماہیت کیا ہے یہ نہ بتایا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات کو خدا نے ''جدید یا منفرد تخلیق'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے یہ نہ تو طبیعی ارتقاء کی پیداوار ہے اور نہ ہی طبیعی قوانین کے تابع جن کے مطابق انسانی مشینری زندہ اور مصروفِ عمل رہتی ہے۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک غیر مادی ''شے'' ہے جو اختیار و ارادہ کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس اختیار و ارادہ کی آزادی میں انتخاب کرنے میں اسے عقل اور علم کی دونوں صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے قوانین مقرر ہیں' اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی خدا کی طرف

سے قوانین دیئے گئے ہیں۔ انسانی جسم کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ شخص خود کھائے یا استعمال کرے۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے۔ بالفاظِ دیگر، جسم کی پرورش، لینے سے ہوتی ہے ذات کی پرورش ''دینے'' سے الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (92:18)- وہ شخص جو ہر اس چیز کو (مالی یا علمی نوعیت وغیرہ کی) جو اس کے پاس ہے وہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے اور جس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے وہی مقصدِ حیات میں کامیاب ہوتا ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَکّٰی (87:14)- لہٰذا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ انسان اجتماعی زندگی بسر کرے۔ اس کے بغیر اس کی ذات کی نشوونما نہیں ہوسکتی۔ انسان کو سیاست میں ''تمدنی جانور'' اسی لئے کہا جاتا ہے کہ معاشرہ کے اندر رہنا اس کی جبلت میں شامل ہے۔ ذات کی نشوونما کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں ہر شخص کی جسمانی ضروریات بھی بآسانی پوری ہوتی رہیں اور اس کے ساتھ اسے اس کی ذات کی نشوونما کے پورے پورے مواقع اور اسباب و ذرائع بھی میسر ہوں۔ ایسے معاشرہ کو قرآن جنتی معاشرہ سے تعبیر کرتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوا ہو۔ اس میں ہمارا دوسرا گروہ جماعتِ مومنین کا شامل ہوتا ہے جو قرآنی نظریہ قومیت پر ایمان رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ: فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ o وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (89:29-30)۔ تم (جماعتِ مومنین) کی جماعت میں شامل ہو جاؤ اور اس طرح جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ۔

یہ بھی یاد رہے کہ نشوونما یافتہ ذات، انسانی جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہوتی، بلکہ بدستور زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ ایک چیز ہے حیات بعد الممات (Survival after death) اور دوسری چیز حیاتِ جاوداں (Immortality)۔ حیات بعد الممات تو ہر ذی شعور انسان کے لئے ہے لیکن حیاتِ جاوداں صرف اس ذات کے حصے میں آسکتی ہے جس کی باقاعدہ نشوونما ہو چکی ہو۔ حیاتِ جاوداں ملنے سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کی طبیعی موت کے بعد، اسے پھر موت نہیں آئے گی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں: لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُوْلٰی (4:56)- یہ لوگ اس میں، اس پہلی موت کے علاوہ (جس کا مزہ وہ پہلے چکھ چکے ہیں) موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔''

لہٰذا وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کریں گے۔

عزیزانِ گرامی قدر! امید ہے دونوں سیکولر اور قرآنی نظریہ قومیت آپ کی نظروں میں آ گیا ہوگا اور آپ قرآنی

نظریہ کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف ہو گئے ہوں گے۔

ان دونوں سیکولر اور قرآنی نظریہ قومیت کی وضاحت محترم پرویز نے قرآن کی روشنی میں اپنے مخصوص انداز میں اول الذکر کو مذہب اور دوسرے کو دین کے عنوان سے پیش کر کے کی ہے۔ ہم ملاحظہ کر چکے ہیں کہ سیکولر نظام حکومت میں قومیت کا مدارِ اشتراک نسل یا وطن ہے۔ وطن کو ایک خاص خطہ پر محدود کر کے وہاں حکومت انسانوں کے وضع کردہ قوانین سے کی جاتی ہے۔

اس کے برعکس نظریہ پاکستان پیش کرنے والی دونوں مقتدر ہستیوں نے قرآنی نظریہ قومیت (وحی) پر مبنی اپنے نظریہ پاکستان کو ایمان کا اشتراک قرار دیا اور پوری عالمگیر انسانیت کو خطاب کیا ہے۔ مذہب اور دین کے تقابل میں سمجھنے کی یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ سیکولر (عصری) نقطہ نگاہ سے دین کو مذہب ہی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس علامہ اقبال اور قائداعظم اپنے نظریات میں مذہب کے لئے کوئی جگہ نہیں پاتے۔ وہ دین اور صرف دین ہی کے تناظر میں نظریہ پاکستان پیش کرتے ہیں۔

پاکستان کے دانشور طبقہ میں قائداعظم کے دین کے نظریہ (جس کی آگے وضاحت کی جارہی ہے اسے جہالت اور لاعلمی کی بنا پر ان پر سیکولر نظام کے نفاذ کرنے کو منسوب کیا جارہا ہے۔ قائداعظم کے نظریہ دین کی وضاحت بہت ہی کم پلیٹ فارم سے سنائی دیتی ہے' اس لئے کچھ دانشور طبقوں کی نظر میں دین' مذہب ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ مذہب کی مخالفت تو خود قائداعظم کی طرف سے بھی ہوتی ہے' اور یہ نام نہاد دانشور طبقہ مذہب اور دین کے فرق سے لاعلم ہونے کی بنا پر قائداعظم پر سیکولر ہونے کا الزام لگا دیتے ہیں۔

لہٰذا ان دونوں نظریات کا تقابل پیش کیا جاتا ہے۔

## مذہب اور دین کا تقابلی جائزہ

| مذہب (سیکولر نظریہ) | دین (قرآنی نظریہ قومیت) |
|---|---|
| 1- مذہب' خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔ | دین اجتماعی نظام زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔ |
| 2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ | دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بنا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔ |

| | |
|---|---|
| 3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔ | دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔ |
| 4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔ | دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔ |
| 5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔ | دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب' رب العالمین اور رسول رحمتہ العالمین کا مقام رکھتے ہیں۔ |
| 6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ | دین' انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کا پیغام کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ |
| زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز | زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز |
| 7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔ | دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔ |
| 8- مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔ | دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ |
| 9- مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔ | دین' اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے' حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔ |
| 10- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔ | دین' اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔ |
| 11- مذہب' کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔ | دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے' جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔ |

| | |
|---|---|
| 12- مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔ | دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔ |
| 13- مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔ | دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک پر بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔ |
| 14- مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)' سرمایہ دارانہ (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔ | دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جاسکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوع انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔ |

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دین کی اطاعت کرتا ہے۔

عزیزانِ گرامی قدر! محترم پرویز صاحب کے دیئے ہوئے مذہب اور دین کے تقابل سے امید ہے کہ دونوں نظریات کا فرق واضح ہو گیا ہوگا۔ لہٰذا اب وقت آ گیا ہے کہ بات کو آگے بڑھایا جائے۔ ہمیں یہ بات ملحوظِ نظر رکھنی چاہئے کہ قرآنی نظریہ قومیت پر ایمان رکھنے والوں کے لئے انسانی ذات کی نشو ونما کے لئے صرف معاشرہ کی موجودگی ہی کافی نہیں بلکہ ایسے معاشرہ کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی ہے جہاں قرآنی اقدار کا عملاً نفاذ بھی ہو جس میں قرآنی معاشرہ کی تمام خصوصیات شامل ہوں۔

## قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا۔۔۔؟

1- قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلاتمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجا آوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

2- کوئی شخص بے کس و لاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی، اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

3- کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

4- معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

5- ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے، جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں، یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

6- ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضامندی سے حاجت مندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھے گا۔ ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔

7- رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجت مندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائیدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

8- ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں، لیڈروں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔) اس لئے اس میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد، نہ ظلم ہوگا

نہ زیادتی۔ اسے نظام خداوندی یا قرآنی نظام معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

9- ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد و بھروسہ ہوگا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

10- یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص قوانین خداوندی کے محکم اور مکافات عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ احباب کے دل میں یہ خیال آ رہا ہو کہ ایسے قرآنی معاشرہ کے قیام کا خیال ایک خیالی معاشرہ (Utopia) ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ خیالی معاشرہ نہیں بلکہ درج ذیل طریق سے ہر دور میں قابلِ العمل ہے۔

## قرآنی نظام کے نفاذ کے لئے طریقِ کار

جو جماعت کسی مستقل قدر یا غیر متبدل اصول کی پابند نہیں ہوتی' وہ اپنے نظام کو نافذ کرنے کے لئے جو طریق بھی چاہے' اختیار کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک طریق کار کے جائز یا ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو طریق بھی حصولِ مقصد کے لئے ممد و معاون ہو' وہ ان کے ہاں جائز قرار پاتا ہے۔

ان کے برعکس جو جماعت مستقل اقدارِ حیات اور غیر متبدل اصولوں پر ایمان رکھے' اس کے نزدیک ذرائع اور مقصد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد حق پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے ذرائع بھی وہی اختیار و استعمال کر سکتی ہے جو مبنی برحق ہو۔ وہ اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے کہ غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا' لہٰذا' جو جماعت قرآن کا نظام نافذ کرنا چاہے وہ کبھی کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتی جو قرآن کی رو سے باطل ہو۔ لوٹ مار' قتل و غارت گری' خلفشار' انتشار وغیرہ قرآن کے نزدیک سخت مذموم اور جھوٹ' فریب' مکاری' عیاری بدترین جرائم ہیں۔ وہ اس طریق کار کو فساد قرار دیتا ہے اور مفسدین اس کے نزدیک بدترین خلائق ہیں۔ اس کا طریق انقلاب ہے فساد نہیں اور ان دونوں میں جو بنیادی فرق ہے اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ آج کل بدقسمتی سے فساد ہی کو انقلاب کہہ کر پکارا جا رہا ہے۔

قرآن کریم کے نزدیک خارجی دنیا (یا نظام) میں کوئی صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس تبدیلی کی متمنی جماعت کے افراد کے قلب و نگاہ میں' قرآنی اقدار کے مطابق تبدیلی پیدا نہ ہو۔ وہ قلب و نگاہ کی اس داخلی تبدیلی کو انقلاب قرار دیتا ہے۔ قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا کام' ایک دن کی بات نہیں۔ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب بھی ہوتا ہے

اور کافی وقت کا متقاضی بھی۔ اس مرحلہ میں صبر طلبی ہی دشواری نہیں ہوتی بلکہ قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا یہ مرحلہ بڑا غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ اس میں بظاہر نہ کوئی حرکت نظر آتی ہے نہ حرارت۔ اس لئے سطح بین نگاہیں اسے ''بے عملی'' سے تعبیر کر دیتی ہیں اور ان کے اس طعن سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اس جماعت کے زیر تربیت افراد اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دنیا بہت آگے نکلے جا رہی ہے اور ہم یونہی اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن قرآنی جماعت نہ اغیار کے اس قسم کے طعنوں سے متاثر ہوتی ہے نہ خود اپنے اندر کے افراد سے مصالحت کی خاطر اپنا راستہ بدلنے کے لئے تیار۔

خود نبی اکرم ﷺ اور جماعتِ مومنین کی مکی زندگی کے تیرہ سالہ طول طویل (اور بظاہر بے حس و حرکت) مدت اس صبر طلبی عشق کی مظہر تھی۔ جب اس جماعت کے افراد میں قلب و نگاہ کی ایسی تبدیلی اور سیرت و کردار میں ایسی پختگی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس نظام کے قیام کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے اور اس میں کوئی حربہ ایسا استعمال نہیں کرتی جسے قرآن فساد قرار دیتا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس منزل کے حصول کے بعد قرآنی معاشرہ کا قیام درج ذیل اقدامات سے ممکن العمل ہو سکتا ہے۔

1- ایک آزاد مملکت اس امر کا اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار، قرآنِ کریم کے مطابق ہوگا۔

2- قرآنِ کریم میں کچھ احکام و قوانین، متعین شکل میں دیئے گئے ہیں اور بعض اقدار، اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کے احکام و قوانین ہوں یا اصول و اقدار، سب غیر متبدل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔

3- جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں، مملکت کے ارباب فکر و نظر، نمائندگانِ ملت، ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان سے جزئی قوانین مرتب کریں گے۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث، تاریخ، فقہ کو اپنے سامنے رکھیں گے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، قوانین مرتب کریں گے۔ جو کچھ پیچھے سے چلا آ رہا ہے، اس میں سے جو قوانین ایسے ہوں گے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں اور جو ہمارے زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، انہیں ایسے ہی رہنے دیا جائے گا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، ان میں تبدیلی کر لی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو، نیا قانون بنا لیا جائے گا۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین، زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ، بدلتے جائیں گے۔ یوں مستقل اور قابل تغیر و تبدل عناصر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ ملت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com

# دابّۃ الارض کی وضاحت

قرآن کریم میں دجال، مجدد، محدث، نزول مسیح، آمد مہدی جیسے نظریات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن ہماری کتب روایات و تفاسیر ان کے ''تذکار جلیلہ'' سے بھری پڑی ہیں۔ ان روایات نے جس قدر نقصان ہم مسلمانوں کو پہنچایا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اور اس کا اندازہ ہم سب مسلمانوں کو اچھی طرح ہے۔ جن حضرات نے بھی نبوت کے دعاوی کئے وہ سب انہیں سیڑھیوں سے آہستہ آہستہ ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں دابۃ الارض کا ذکر البتہ آیا ہے اور چونکہ یہ الفاظ قرآن کریم میں آ گئے ہیں، اس لئے ان کی تفسیر ضروری ہوئی۔ لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ ان الفاظ کی وضاحت کے لئے آپ جس قدر بھی تفاسیر کا مطالعہ فرمائیں گے، یقیناً آپ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکیں گے کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ صرف چند تفاسیر کے حوالہ جات پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں، ان کے مطالعہ سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ ہماری ان مستند اور معتبر ترین تفاسیر میں کس قسم کا مواد ہے۔ سورہ نمل کی اس آیۂ کریمہ میں ارشادِ عالی ہوتا ہے:

**وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ** (27:82)-

اس آیۂ کریمہ کے تین تراجم ملاحظہ فرمائیں۔

(1) اور جب (اللہ کا) قول قریب آ جائے گا تو ہم زمین سے ایک چوپایہ ان کے لئے برآمد کریں گے وہ دابہ لوگوں سے کہے گا کہ (کافی) لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں لاتے تھے۔ (تفسیر مظہری)۔

(2) اور ان کے اوپر عذاب کا وقت ثابت ہو جائے گا تو ہم زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرتا ہوگا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)۔

(3) اور جب پڑ چکے گی ان پر بات، نکالیں گے ہم ان کے آگے ایک جانور زمین سے، ان سے باتیں کرے گا، اس واسطے کہ لوگ ہماری نشانیاں یقین نہ کرتے تھے۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب)۔

(4) وچون متحقق شود وعدۂ عذاب برایشاں بیرون آریم برائے ایشان جانورے از زمین کہ سخن گوید بایشاں بسبب آن کہ مردمان بآیاتِ ما یقین نمی آوردند۔ (از فتح الرحمٰن، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی)۔

ان ہی سابقہ روایات و تفاسیر کو سامنے رکھ کر پکتھال (Pickthall) نے ترجمہ کیا۔

(5) And when the word is fulfilled concerning them, We Shall bring forth a beast of the earth to speak unto them because mankind had no faith in our revelation.

آیۂ کریمہ کے پانچ تراجم جناب نے ملاحظہ فرمائے۔ اب اس کی چند تفاسیر بھی ملاحظہ فرمائیں کہ وہ اس جانور کی تصویر کشی کس کس طرح کرتی ہیں۔

(1) پہلی تصویر یہ ہے کہ ابنِ جریج کی روایت ہے کہ: ابوالزبیر نے دابۃ الارض کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں۔ اس کا سر بیل کے سر جیسا ہو گا' اس کی آنکھیں خنزیر کی طرح ہوں گی' اس کے کان ہاتھی کے کان جیسے ہوں گے' اس کے سینگھ بارہ سنگھے کے سینگوں کی مانند ہوں گے۔ اس کا سینہ شیر کا سینہ ہوگا' اس کا رنگ چیتے کا رنگ ہوگا' اس کی کوکھیں بلی کی کوکھوں کی طرح ہوں گی۔ (نوٹ۔ جب سینہ شیر جیسا ہوگا تو کوکھ بلی جیسی کیسے ہوسکتی ہے۔ بہرحال آگے چلیں) اس کی دم مینڈھے کی دم کی طرح ہوگی' اس کی ٹانگیں اونٹ کی ٹانگوں کی مثل ہوں گی' ہر دو جوڑوں کے درمیان بارہ ہاتھ کا فاصلہ ہوگا' اس کے پاس موسیٰ کی لاٹھی اور سلیمان کی انگشتری ہوگی' ہر مومن کے سجدے کے مقام' پیشانی یا ناک پر لاٹھی کی نوک سے نشان بنا دے گا' جس سے اس کا چہرہ جگمگائے گا اور سلیمان کی انگوٹھی سے ہر کافر کے چہرہ کو نشان زد کرے گا' جس سے اس کا چہرہ کالا ہو جائے گا۔ (تفسیر مظہری' جلد نہم' صفحہ 52)۔

(2) اب دوسری تصویر ملاحظہ فرمائیں۔ پہلی تصویر کی روایت ابن جریج کی تھی۔ اب حضرت ابوہریرہ کی پیش کردہ تصویر ملاحظہ فرمائیں۔ انہوں نے فرمایا: ''اس کے جسم پر سب رنگ ہوں گے' اس کے دو سینگوں کے مابین سوار کے لئے ایک فرسخ کی راہ ہوگی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: اس کے بال ہوں گے' کُھر ہوں گے' ڈاڑھی ہوگی' دُم نہ ہوگی۔ تین دن میں مشکل سے ایک تہائی باہر آئے گا حالانکہ تیز گھوڑے کی رفتار سے چلتا ہو گا''۔ (دابۃ الارض کے ڈاڑھی ہوگی' مگر دُم نہیں ہوگی' مگر یہ نہیں لکھا کہ کتنی بڑی ہوگی)۔

(3) ایک اور تصویر ملاحظہ فرمائیں: ملا جیون کی تفسیر احمدی میں یہ تصویر بیان کی گئی ہے۔ وہ جانور ساٹھ گز کا ہوگا۔ وہ اس قدر بھاگے گا کہ کوئی اس سے آگے نہیں نکل سکے گا۔ اس کے چار پاؤں اور پر اور رُوئیں ہوں گے اور دو بازو۔ منہ آدمی جیسا ہو گا۔ آنکھیں سور کی سی۔ کان ہاتھی کے۔ سینگ پاڑے کے سے۔ گردن شتر مرغ کی سی۔ سینہ شیر کا سا۔ رنگ چیتے کا سا۔ کوکھیں بلی کی سی' دم بھیڑ جیسی۔ پتھر سے اس طرح نکلے گا جس طرح صالح

علیہ السلام کی اونٹنی نکلی تھی۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ رفتہ رفتہ تین دن میں نکلے گا یا ایک ہی دن میں۔

(4) تفسیر حسینی کی تصویر بھی ملاحظہ فرمائیں: درعین المعانی آوردہ کہ چشم او چوں خُوک بود۔ گوشِ او چوں گوش فیل' و شاخِ او مانند شاخ گاوَ' ولونِ او مثلِ لَونِ پلنگ وگردنش چوں گردنِ شترمُرغ وسینہ اش چون سینۂ شیر' پہلوش چوں پہلوئے یُوز (چیتا) وقوائمش چون قوائم شتر ودُمش چون دم غوچ۔

تقریباً وہی حلیہ بیان کیا گیا ہے جو سابقہ تفاسیر میں ہے۔ عبارت اتنی آسان ہے کہ ترجمہ کی ضرورت نہیں' بَس غوچ' خُوک اور یُوز مشکل لفظ ہیں ان کے معنے علی الترتیب مینڈھا' سور اور چیتا ہیں۔ باقی عبارت آسان ہے ترجمہ کی ضرورت نہیں۔

جس قدر بھی تفاسیر ہیں سب میں کچھ معمولی فرق کے ساتھ اسی قسم کا حلیہ دابۃ الارض کا لکھا گیا ہے۔ مزید اقتباسات سے مضمون خواہ مخواہ طویل ہوتا ہے۔ اس لئے ان ہی حلیوں پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

اب دابۃ الارض کے نکلنے کے مقامات اور حالات ملاحظہ فرمائیں:

(1) حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس کے چار پیر ہوں گے' صفا کی وادی سے نکلے گا اس قدر تیزی سے خروج کرے گا کہ کوئی بہت تیز رفتار گھوڑا ہو۔

(2) حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا: جیاد میں ایک چٹان ہے اس کے نیچے سے نکلے گا میں اگر وہاں ہوتا تو تمہیں وہ چٹان دکھا دیتا۔

(3) حضرت عزیر کے ایک مکالمہ سے حکایت ہے کہ سدوم کے نیچے سے یہ نکلے گا۔ اس کے کلام کو سب سنیں گے۔ حاملہ کے حمل وقت سے پہلے گر جائیں گے۔ شیریں پانی کڑوا ہو جائے گا۔

(4) ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ لے کر مکہ کے پاس ایک جنگل میں لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک خشک زمین ہے جس کے آس پاس ریت ہے۔ فرمانے لگے: یہیں سے دابۃ الارض نکلے گا۔ یہ چاروں اقتباسات تفسیر ابن کثیر سے لئے گئے ہیں۔

(5) موضح القرآن میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے تحریر فرمایا: ''قیامت سے پہلے صفا پہاڑ مکہ کا پھٹے گا۔ اس میں سے ایک جانور نکلے گا' لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور سچے ایمان والوں کو چھپے منکروں کو جدا کر دے گا نشان دے کر۔''

ان پانچ حوالہ جات سے کسی خاص جگہ کا تعین نہیں ہوتا کہ یہ دابہ کس جگہ سے برآمد ہوگا۔

مضمون کے شروع میں تحریر کیا گیا تھا کہ آپ جس قدر تفاسیر مطالعہ فرمالیں' آپ اس آیۂ کریمہ کے بارے میں کسی بھی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی خیال شریف میں رکھئے کہ ہمارے علماء کرام اس بات پر سخت اصرار کرتے ہیں کہ یہ روایات جن کے ذریعے آیات قرآنی کی تفسیر کی جاتی ہے یہ وحی ہیں' اور منزل من اللہ ہیں۔ اور قرآن کی مثل (مثلہٗ معہ) ہیں نیز ان حضراتِ

گرامی قدر کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ سابقہ تحریر شدہ تفاسیر کے سلسلہ میں سلفِ صالحین سے بال برابر بھی انحراف نہ کیا جائے۔

ہمارے مفسرین کرام نے جو تفاسیر تحریر کی ہیں اس میں انہوں نے نہایت نیک نیتی سے بہت محنت کی ہے' ہمیں ان کا احترام ہے' جو بات قابل اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تحریر کو حرفِ آخر قرار دیا جائے۔ ان کی تحریر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آخری سند قرار دینا غلط ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان مفاہیم کو حضورﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ منسوب کر دینے سے تفسیر میں غور وفکر کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے' کیوں کہ حضورﷺ کی طرف منسوب کردہ تفسیر کے بعد کسی کو یہ جرأت نہیں رہتی کہ وہ اپنی تفسیر پیش کرے۔ اگر ہمارے ہاں یہ نظریہ نہ ہوتا کہ یہ تفاسیر حضورﷺ کی بیان کردہ ہیں اور قرآن فہمی کا دروازہ اس طرح بند نہ کر دیا جاتا تو اس عرصہ میں نہایت عمدہ اور عہد بہ عہد کے مطابق تفاسیر تحریر میں آتیں' لیکن افسوس کہ اس نظریہ نے مفسرین کی فکر کو بالکل جامد کر دیا۔

اب آیۂ کریمہ کی تفسیر پیش خدمت عالی کی جاتی ہے:

(1) اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں پہلی غلطی ہمارے مفسرین کرام سے یہ ہوئی کہ انہوں نے دابہ سے مراد ایک جانور لیا ہے۔ اور اسی ایک بنیادی غلطی کی وجہ سے پھر آیت کا سارا مفہوم ہی غلط ہوتا چلا گیا۔ مصباح اللغات' نے دَبَّ کے معنے رینگنا' ہاتھوں اور پیروں کے بل چلنا کئے ہیں۔ رینگنے کی مناسبت سے جدید عربی میں فوجی ٹینک (Tank) کو الدبابۃ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی حرکت رینگنے کے مانند ہوتی ہے۔ مفردات میں امام راغب نے اس کا ترجمہ آہستہ آہستہ چلنا کئے ہیں۔ اس اعتبار سے دابہ کے معنے چلنے والے کے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا اطلاق صرف جانوروں پر ہی نہیں ہوتا' انسانوں پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے خود قرآن کریم نے اس کا اطلاق حیوانات اور انسان دونوں پر کیا ہے۔ (11:6, 24:45)۔ اور آیت مبارکہ **وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ** (35:45)- اور اگر اللہ انسانوں کے اعمال کی وجہ سے فوراً ہی ان کو پکڑ لیتا' تو زمین پر ایک متنفس بھی زندہ باقی نہیں رہ سکتا۔ یہاں دابہ صرف انسانوں کے لئے استعمال ہوا ہے کیونکہ مواخذہ صرف انسانوں سے کیا جاتا ہے۔ حیوانات سے مواخذہ نہیں ہوسکتا۔ سورہ انفال میں عقل سے کام نہ لینے والے انسانوں کو **شرّ الدّواب** کہا ہے۔ **إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لاَ يَعْقِلُون** (8:22)- اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق تو بہرے' گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ان دونوں آیات میں دابہ سے مراد صرف انسان ہیں۔ حیوان ان آیات میں شامل ہی نہیں ہو سکتے۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ لفظ دابہ کا اطلاق واحد' اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔

(2) دوسرا لفظ تکلمہ کا غور طلب ہے۔ یہاں اس کے اصلی معنے بولنے کے لئے جاسکتے ہیں۔ لیکن کلمہ کے معنے زخمی کرنے کے بھی آتے ہیں اور تکلمہ کے معنے قرآن نے دلیل دینے اور ثابت کرنے کے بھی کئے ہیں۔ جبکہ ارشاد ہوتا

ہے: أَمْ أَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَاناً فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ (30:35)- کیا ہم نے اتاری ہے ان پر کوئی دلیل جو شہادت دے رہی ہو ان چیزوں کے حق میں جن کو یہ خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہاں ظاہر ہے کہ لفظ ''تکلمہ'' اس عام معنے میں نہیں ہے' جس معنے میں ہم بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم کسی چیز کے حق میں دلیل یا شہادت ہوتا ہے۔

(3) وَقَعَ القول علیھم سے مراد یہ ہے کہ جب ان کے بارے میں اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے اور جس سزا کے جو مستحق ہیں وہ ان کو آ گھیرے۔

(4) دابّہ کے سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ دابّہ کے ساتھ ارض یعنی زمین کا ذکر عام طور پر آتا ہے۔ گویا محاورۂ عرب میں یہ لفظ ارض کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں دابۃ من الارض سے یہ سمجھنا ضروری نہیں کہ یہ کوئی جانور ہوگا جو زمین کو شگافتہ کر کے' اندر سے برآمد ہوگا۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ ارضی مخلوق ہوگا۔ کوئی آسمانی یا روحانی مخلوق نہیں ہوگا۔

ان چار نکات کی تشریح وتمہید کے بعد اب آیت کا مفہوم پیشِ خدمتِ عالی ہے۔ آیۂ کریمہ اپنے خیال شریف میں پیشِ نظر رکھیں وہ اوپر تحریر کی جا چکی ہے۔

آیۂ کریمہ میں قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں یہ نکتہ پیش کیا جا رہا ہے کہ جب کسی قوم کے برے اعمال کی وجہ سے' قانونِ الٰہی کے مطابق جس زوال و تباہی کی وہ مستحق ہے' اس کے ظہور کا وقت آ جائے اور وہ قوم ذلت' خواری کے عذاب میں مبتلا ہو جائے' تو اس وقت ہم اس قوم میں کوئی ایک صاحب فکر یا کوئی ایک جماعت مفکرین کی پیدا کر دیتے ہیں جو اسی زمین کی مخلوق ہوگی اور یہاں کے ہی انسانی ذرائع استعمال کرے گی۔ وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہوگی کہ روحانی یا Super Natural ذرائع استعمال کرے وہ مفکر یا مفکرین کی جماعت یہ ثابت کرے گی (تکلمھم) کہ یہ زوال اور تباہی اس لئے آتی ہے کہ اس قوم نے قانون الٰہی' اور آیاتِ خداوندی پر یقین نہیں کیا تھا اور اس کے برخلاف اپنے ذہن کے وضع کردہ مفاد پرستانہ قوانین پر عمل کرتے رہے۔ ہر دور میں ایسے مفکرین پیدا ہوتے رہے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے۔

جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے کَلَمَ کے معنے زخمی کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اگر تکلمھم کے معنے ثابت کرنے کے بجائے زخمی کرنا لئے جائیں تو آیۂ کریمہ کا مطلب ہوگا کہ ان زوال پذیر اور ہلاکت و تباہی کے حالات میں جب اس قوم کے اعمال کے ظہور نتائج کا وقت آ جاتا ہے تو ایسے صاحب طاقت و قوت لوگ پیدا ہو جاتے ہیں' جو قوت یا تلوار کے زور پر اس قوم کی اصلاح کر دیتے ہیں' ان دونوں صورتوں میں یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مفکر یا مفکرین کی جماعت' یا فوجی سپہ سالار وجرنیل قرآن کریم کا نظام قائم کر دیں۔

ہمارے ہاں چونکہ تفاسیر روایات کے ذریعے ہوتی ہیں' اس لئے اس آیت کی تفسیر بھی شروع سے بالروایات ہی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ یہ تفاسیر غور وفکر کا کوئی

راستہ ہی نہیں چھوڑتیں اسی لئے وہاں سے کوئی روشنی نہیں ملتی۔ اس بات پر تو یقیناً اصرار ہے کہ اس آیت کی سابقہ تمام تفاسیر' خلاف عقل وخلاف قرآن ہیں' اس لئے ان کے غلط ہونے پر اصرار ہے' لیکن زیرنظر ہماری پیش کردہ تفسیر کی صحت پر قطعاً کوئی اصرار نہیں ہے کیونکہ یہ ایک انسانی کاوش ہے اور ہر شخص قرآن فہمی میں غور وفکر کرسکتا ہے۔

من از ہمدردی ات گفتم تو خود ھم فکر کن بارے
خرد از بہر این روز است' اَے دانا و ہوشیارے

آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین


## قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہوچکی ہے۔ یہ جلدیں بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ خصوصی رعایتی ہدیوں پر دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

| نام کتاب | سورہ | صفحات | رعایتی ہدیہ | نام کتاب | سورہ | صفحات | رعایتی ہدیہ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| سورہ الفاتحہ | (1) | 240 | 120/- | سورہ روم' لقمان' السجدہ | (30,31,32) | 444 | 250/- |
| سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن) | (1) | 240 | 70/- | سورہ یٰسٓ | (36) | 164 | 100/- |
| سورہ النحل | (16) | 334 | 150/- | 29واں پارہ (مکمل) | ---- | 541 | 250/- |
| سورہ بنی اسرائیل | (17) | 396 | 175/- | 30واں پارہ (مکمل) | ---- | 624 | 250/- |
| سورۃ الکہف ومریم | (18-19) | 511 | 200/- | | | | |
| سورہ طٰہٰ | (20) | 416 | 180/- | | | | |
| سورۃ الانبیآء | (21) | 336 | 150/- | | | | |
| سورۃ الحج | (22) | 380 | 180/- | | | | |
| سورۃ المؤمنون | (23) | 408 | 200/- | | | | |
| سورۃ النور | (24) | 263 | 150/- | | | | |
| سورۃ الفرقان | (25) | 389 | 200/- | | | | |
| سورۃ الشعرآء | (26) | 453 | 230/- | | | | |
| سورۃ النمل | (27) | 280 | 170/- | | | | |
| سورہ القصص | (28) | 334 | 200/- | | | | |
| سورہ عنکبوت | (29) | 387 | 220/- | | | | |

ان خصوصی رعایتی ہدیوں پر مزید کوئی کمیشن/ رعایت نہیں دی جاتی۔ خرچہ ڈاک اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

# انتخاب لغات القرآن

1- آخرت، اس مستقبل کا بھی نام ہے جو انقلاب آفرینی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے۔

2- اَسَف، سے مطلب انتقام کے جذبہ کے ماتحت خون دل کا جوش کھانا ہے۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمتر کے لئے پیش آئے تو غَضَب، کہلاتی ہے اور اگر اپنے سے برتر کے لئے آئے تو حُزْنٌ، کہلاتی ہے۔

3- جب مختلف افراد کے سامنے نصب العین حیات ایک ہو، منزل ایک ہو، راستہ ایک ہو، ضابطہ زندگی ایک ہو، تو پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے پیوستگی کیوں نہ ہوگی۔ یہی مومنین کا معاشرہ ہوگا۔

4- جِبْت، ۔ ہر بے حقیقت اور بے معنی چیز۔ توھم پرستیاں۔ رسومات جن میں روح نہ ہو۔ جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ جو قوم بھی خدا کے الدین کو چھوڑ دیتی ہے وہ جبت اور طاغوت کو اپنا ''معبود'' بنا لیتی ہے۔

5- ظلم روکنے والا ''جبار''، نوع انسان کے لئے آیہ رحمت اور خیر ہے، اور ظلم کرنے والا ''جبار'' موجبِ عذاب وشر۔

6- قرآن کریم کی رو سے فرد یا قوم، جس مقام پر رک جائے، وہ جحیم (جہنم) ہے۔

7- جَدَث، اور مَرْقَد، (خواب گاہ) ہم معنی ہیں اور مقصود کوئی خاص مقام نہیں، کیفیت ہے۔

8- خیر وشر کا معیار کتاب اللہ ہے۔ کائنات کی میزان میں فیصلے انسان کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے۔ خدا کے اٹل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں۔

9- صلوٰۃ کے مقامی اجتماعات سے لے کر حج کے عالمگیر اجتماع تک ہر اجتماع کی غرض یہ ہے کہ امت کے نمائندے باہمی مشاورت سے قرآنی نظام کے استحکام اور نوعِ انسان کی بہبود کے سامان وذرائع پر غور کریں۔

10- جہنم کا ایندھن سرمایہ پرست اور ان کی وہ دولت ہے جسے وہ نوع انسانی کی منفعت کے لئے عام نہیں کرتے بلکہ انفرادی مفاد کی خاطر جمع رکھتے ہیں۔

11- چند حدود (Limitations) کے اندر کھلی آزادی۔ یہ ہے قرآن کا عطا کردہ دین۔

12- انسان زمین میں بیج ڈال (حَرث) سکتا ہے اس بیج کو زمین سے اگانا (زَرع) اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

13- بغیر جبر (اکراہ) اور تنگی (حرج) کے دین میں داخل ہونے کا مطلب اس کے تمام قوانین وضوابط کو بہ طیب خاطر ماننا ہے۔ جبر اور تنگی محسوس ہونے پر نظام کے دائرے سے باہر نکل جانا چاہئے اس لئے کہ دین میں جبر اور تنگی نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

# جھوٹ اور حرام چھوڑ کر، حلال رزق سے ملکی حالات ٹھیک ہونگے

**(دوران گفتگو یہ الفاظ مجھے ایک ہموطن پاکستانی بھائی نے کہے۔ نہایت قابلِ تعریف اور غور وفکر کی محتاج بات ہے)**

صدق کے مقابلہ میں کذب آتا ہے۔ اس کے عام معنی جھوٹ کے ہیں لیکن قرآن کریم نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اس جھوٹ سے مراد کیا ہے۔ سورۃ منافقون میں ہے کہ اے رسول ﷺ! یہ منافقین تیرے پاس آ کر کہتے ہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ بات بالکل سچی تھی۔ اس کے بعد ہے کہ اللہ بھی اسے جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے۔ اس سے اس بات کی مزید تائید ہوگئی کہ ان کی یہ بات بالکل سچ تھی لیکن اس کے بعد ہے کہ خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ:

إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُونَ (63:1)-

یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ بات خواہ سچی ہی کیوں نہ ہو، اگر کہنے والے کا دل، اس کی زبان سے ہم آہنگ نہیں تو وہ شخص کاذب (جھوٹا) ہے۔ لہٰذا کذب کے ایک معنی تو ہوں گے جھوٹی بات کہنا اور دوسرے معنی ہوں گے قلب اور زبان کا ہم آہنگ نہ ہونا۔ اگر ہم ایک بات کہتے ہیں لیکن اس کے مطابق کام نہیں کرتے تو یہ جھوٹ ہے۔ سورۃ الصّف میں اللہ کا ارشاد ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَo كَبُرَ مَقْتاً عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (61:2-3)-

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو (تم اپنے دعویٰ ایمان کا ثبوت اپنے عمل سے پیش کرو۔ ایسا کبھی نہ کرو کہ) زبان سے بڑے بڑے دعوے کرتے رہو اور انہیں عملاً پورا کر کے نہ دکھاؤ۔ جو کچھ زبان سے کہو اسے عمل سے پورا کر کے دکھاؤ۔ قول وفعل میں ہم آہنگی، دعویٰ ایمان کی صداقت کا ثبوت ہے۔

قانونِ خداوندی کی رو سے یہ بات بڑی مذموم اور قابلِ

گرفت ہے کہ ایسی باتیں کی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے۔صبح وشام' رات دن ہم لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہیں اس کا مطلب ہے اللہ کے سوا کوئی اور صاحبِ اقتدار نہیں' انسانوں کی محکومی واطاعت عملاً اس کی تکذیب ہے۔ افترا سے مراد ہوتی ہے کسی کی طرف غلط باتیں منسوب کرنا۔ اسے بھی کذب کہتے ہیں یعنی کسی کے خلاف جھوٹ باندھنا۔ قرآن کریم میں مذہبی پیشواؤں کے اس مسلک کو افترا اور کذب علی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔جس کی رو سے وہ اپنے جی سے باتیں گھڑتے ہیں لیکن انہیں منسوب خدا کی طرف کر دیتے ہیں یعنی اسے شریعتِ خداوندی کہہ کر پکارتے ہیں۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں ہے کہ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو کذب علی اللہ کرے اور جب صدق اس کے پاس آئے تو اس کی تکذیب کرے۔ مذہبی پیشوا' تکذیبِ آیات کو اپنے رزق کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔

وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ (56:82)-

اس سے پہلے قرآن کریم کے متعلق ہے کہ:

تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (56:80)-

یہ اس خدا کی طرف سے بتدریج نازل ہوا ہے جو تمام نوعِ انسان کا نشوونما دینے والا ہے (اس لئے اس کا مقصود بھی نوعِ انسان کی نشوونما ہے)۔

اس کے بعد ہے کہ:

أَفَبِهَذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ (56:81)-

کیا تم اس ضابطہ قوانین میں خیانت کرتے ہو؟ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کی صحیح تعلیم میں کمی بیشی کرتے ہو! کیا تم اپنے خود ساختہ خیالات کو اس کتاب کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو صحیح مقام سے پھسلانا چاہتے ہو؟ اور یہ سب اس لئے کرتے ہو کہ تمہاری روٹی کا سامان بہم پہنچتا رہے۔تم اس کی تکذیب کو اپنے رزق کا ذریعۂ معاش بناتے ہو۔ (کتنی بری ہے یہ روش اور کیسا پست ہے وہ مقصد جس کے لئے تم یہ سب کچھ کرتے ہو؟ اگر تم اس کے بجائے' اس کے پیش کردہ نظامِ ربوبیت کو قائم کرو' تو تمہیں اس دنیا میں بھی چندہ کے نام سے بھیک مانگ کر کھانے کی بجائے عزت کی روٹی ملے اور تمہاری اُخروی زندگی بھی درخشندہ ہو جائے)۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت یعنی احبار ورُھبان' علماء اور مشائخ دین کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے' اللہ کا فرمان ہے سورۃ توبہ کی آیت نمبر 34 پڑھ لیں۔اور یہ (Profession) ہے ہی معاشی مسئلہ۔ان کی آمدنی کا یہ ذریعہ بند ہو جائے تو یہ اپنے لئے ایک وقت کی روٹی بھی کما نہیں سکتے۔آپ سوچئے کہ لاکھوں' کروڑوں بے کار انسانوں کا انبوہ جو ملک کی پیداوار میں کوئی حصہ نہ لیں اور پھر محنت کشوں کی گاڑھے

پسینے کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کریں' ملک کی تباہی کا باعث نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ پاکستان میں اس گروہ کو دین کی مخالفت کے لئے حیاتِ نو عطا کی گئی۔ مغرب کی استعمار پرست مملکتیں (Fundamentalism) کا فریب انگیز نام دے کر اس کی حیاتِ نو کے لئے تقویت کا موجب بن گئیں اور اب اِن میں سے بعض شدت پسندوں کی مخالفت جاری ہے' بعض کو مسلسل نوازا جا رہا ہے۔ (بمطابق برٹش نیشنل فرنٹ اور سیاسی و مذہبی نقطۂ نظر سے ناجائز' اس ملک میں گرجوں (چرچوں) میں نمازیں پڑھانے والے علمائے کرام' مسلمانوں کی مخالفت میں اضافہ کا باعث بن گئے ہیں۔)

قرآن کریم نے دو عظیم الشان ہستیوں کی سیرتِ طیبہ کو جماعتِ مومنین (بلکہ پوری نوعِ انسان) کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا ہے۔ ایک نبی اکرم ﷺ (33:21) اور دوسرے حضرت ابراہیمؑ۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ (60:4)-

تمہارے لئے (یعنی ہمارے لئے) ابراہیم اور ان کے رفقاء کو بہترین نمونہ (ماڈل) قرار دیا گیا ہے۔

اس کے برعکس صحیح بخاری کی جلد نمبر 4' احادیث نمبر 577, 578 میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے تھے (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ) جماعتِ اسلامی کے بانی و مذہبی راہنما مودودی مرحوم کا بیان ریکارڈ میں موجود ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ بعض حالات میں ضرورت کے تحت جھوٹ بولنا جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ جس قوم کو یہ سبق پڑھایا جائے سچ اس کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا۔

تکذیب یہ بھی ہے کہ انسان جس بات کی صداقت کا قائل ہو اور اس پر ایمان کا مدعی' اسکا عمل اس کے اس ایمان کی شہادت نہ دے۔ سورۃ الماعون میں دیکھئے' کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ:

أَرَأَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (107:1)-

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟

اس کے بعد بتایا کہ:

یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ یہ وہ نمازی ہیں جو صلوٰۃ کی غرض و غایت کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔ جو اس کے ظاہری ارکان و حرکات ہی کو اصلِ صلوٰۃ سمجھے ہوئے ہیں اور رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے

لئے کھلا رہنا چاہئے تھا' بند لگا کر روک لیتے ہیں (107:2-7)۔

اندازہ لگایئے قرآن کریم کی رو سے ''تکذیبِ دین'' کون کرتا ہے اور یہ بھی کہ خود ہمارا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے؟ سورۃ الاعراف میں ہے کہ:

**قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُواْ بِاللّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَاناً وَأَن تَقُولُواْ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ** (7:33)-

ان سے کہو جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں (1) ہر قسم کی بے حیائی کی باتیں' خواہ وہ کھلی ہوں یا پوشیدہ' عملاً ہوں یا ان کی آرزوئیں دل میں کروٹیں لیتی رہیں۔ (2) ایسے امور جن سے انسانی صلاحیتوں میں افسردگی اور اضمحلال پیدا ہو اور عملی قوتیں مفلوج ہو جائیں۔ (3) دوسری طرف ناحق سرکشی اور زیادتی۔ (4) خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرنا یعنی اس کے قوانین کے ساتھ انسانی قوانین کو واجب الاتباع سمجھنا۔ اس کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ سند صرف منزل من اللہ ہوسکتی ہے۔ (5) اور یہ کہ تم خدا کی طرف ایسی باتوں کو منسوب کرو جن کا تمہیں علم نہ ہو کہ وہ فی الواقعہ خدا کی ہیں (خدا کی باتیں صرف قرآن کریم کے اندر ہیں)۔ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے کھانے کے علاوہ حرام کے سلسلہ میں ہے کہ مردار۔ بہتا ہوا لہو۔ سؤر کا گوشت اور **وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّهِ بِهِ** جسے خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں پیر کے نام کا بکرا۔ گیارہویں والے کے نام کی کھیر۔ فلاں حضرت کے نام کی شیرینی' بطور تبرک شیر مادر کی طرح سب حلال قرار پا چکا ہے' حرام کی عادت پختہ ہوگئی ہے اس لئے ہماری قوم کا فی الحال حرام سے اجتناب ناممکن ہے۔ شاید صدیوں بعد کوئی نئی نسل اپنے آباءؑ کی اندھی تقلید چھوڑ کر خدا کی محکومیت اختیار کر کے صراطِ مستقیم پر چل نکلے۔


## ایک عظیم قرآنی خزانہ

**قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری**

مفکرِ قرآنِ مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو DVD پر دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

**قیمت 20 کراؤن فی سی۔ڈی علاوہ ڈاک خرچ میں طلب کیجئے۔**

سی ڈی اور کتب کی خریداری ☆ بیرون ملک bazmdenmark@gmail.com

☆ اندرون ملک' فون: 5753666 42 92+' ای میل: trust@toluislam.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل، بورے والا

# اِختلافِ قرأت کا افسانہ

ماہنامہ ''رُشد'' (99 جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور) کا شمارہ جون 2009ء بطور قرأت نمبر (حصہ اول) شائع کیا گیا ہے جو 719 صفحات پر مشتمل ہے جس میں سبعہ/عشرہ قرأت وغیرہ کی تائید ونصرت کے لئے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ جو مواد اس میں شائع کیا گیا ہے اس کا نہایت جامع، مدلل، شگفتہ، سلجھے ہوئے اور دردمندانہ انداز میں جواب جمیل احمد عدیل صاحب کے مضمون ''اختلاف قرأت کا افسانہ'' میں آچکا ہے جو کہ مارچ 2008ء کے ''طلوع اسلام'' میں شائع ہوا۔ ان کا یہ مضمون اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ (ادارہ)

ہم بھی کیا سادہ ہیں کہ اُس عہدِ زوال میں قرآن کی معنویت اور اہمیت ثابت کرنے کے لیے براہین پیش کررہے ہیں جب ''ترکِ قرآن'' پر ملتِ بیضا متفق ہوچکی ہے بلکہ یوں کہیے قرآن کو ''مہجور'' بنادینے پر ''اجماعِ اُمت'' ہوچکا ہے۔ چنانچہ کیا عجب قرآن کی بات کرنے والوں کو تفرقہ ڈالنے، مسلمات کو متنازع فیہ بنادینے کے جرم میں رگیدا جائے۔ سچی بات ہے ہمیں اُن احباب کے حسنِ ظن پر حیرانی ہوتی ہے جن کا یہ مؤقف ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ درآں حالیکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ واقعتاً قرآن ''منسوخ'' ہوچکا ہے۔ جی ہاں پُورے کا پُورا قرآن ''منسوخ'' ہوچکا ہے۔

جس ریاست میں قرآنی نظام نہ صرف اپنی جزئیات کے ساتھ لاگو نہ ہو بلکہ جزوی طور پر بھی نافذ العمل نہ ہو وہاں بھلے حکمران شب وروز یہ مالا جپتے رہیں کہ قرآن ہمارا آئین ہے، قرآن ہمارا دستور ہے اور عوام بھی دِن رات اس وظیفے میں مشغول ہوں، قرآن ہمارا ضابطۂ حیات ہے، قرآن ہماری رہنما کتاب ہے۔ اس تسبیح سے کیا فرق پڑتا ہے؟

جی صاحبو! مذکورہ کورس کی گائیکی ''لِپ سروس'' سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ نیز پورے گلوب کا جائزہ لینے کے بعد کسی ایک مسلم ملک کا نام ہمیں ضرور بتایئے گا جو ''اِسلامک سٹیٹ'' ہو! اس تناظر میں یہ کہنا کہ قرآن ان لوگوں کے ہاتھوں عملاً منسوخ ہوچکا ہے، کیا غلط ہے؟

اصل سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کو ''منسوخ'' کرنے والے ہیں کون؟ اس عظیم کتاب کی تنسیخ کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اس باب میں ہماری رائے یہ ہے کہ حقیقی ذمہ دار وہ طبقہ ہے جس نے ریب والتباس سے منزّہ اس کتابِ ہدایت کو تشکیک وارتیاب کا مرکز بنا کر رکھ دیا۔ ایسے ایسے شکوک وابہام اس سے منسوب کردیے کہ سچے قاری اس سے دُور ہوتے گئے۔ اس طرح قانون کی یہ کتاب پیشہ ور ''قاریوں'' کی کتاب بن کر رہ گئی۔ ان ہی کی پیروی میں عوام الناس بھی بے سوچے سمجھے عربی عبارت کی دہرائی کو موجبِ ثواب یقین کرتے ہوئے اسی سعدِ عمل تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ قرآن پڑھنے والے پر اس کو سمجھنا ذمہ داری ہے اور اس پر عمل کرنا فرض ہے۔

یہ امر باعثِ حیرت بھی ہے اور وجہٗ دلچسپی بھی کہ قرآن کے حوالے سے تمام تر شکوک وشبہات کا تعلق قرآن کی داخلیات سے نہیں، قرآن کی خارجیات سے ہے۔ آپ اس پس منظر میں کسی ایک نزاعی بحث کی جانب معمولی سا اشارہ نہیں کر سکتے جو قرآن کی اندرونیات سے تعلق رکھتا ہو، ہر اعتراض، ہر مسئلہ بیرونیات سے جُڑا ہے۔ اگر کوئی صرف قرآن کا مطالعہ کرے تو کسی قدم پر لغزش کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ قطعاً کوئی ذہنی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ اُصولِ تفسیر کے بیان میں ہمارے اکثر اکابرین نے دور کی کوڑیاں لانے میں جس مسابقت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان تفصیلات اور اندیشہ ہائے دور دراز کی بجائے اگر اسی اصل الاُصول کو وہ نقطۂ ماسکہ کی حیثیت دیتے کہ قرآن کے سلسلہ میں غیر قرآن کو حَکَمْ (منصف) مقرر کرنا کسی طرح قابلِ قبول نہیں، تو موجودہ انتشار وافتراق کا نام ونشان تک نہ ہوتا۔

مثال کے طور پر اختلافِ قرأت کا خفی سا تذکرہ بھی قرآن کی دفتین میں کہیں موجود نہیں ہے۔ کون نہیں جانتا کہ موضوع مذکور پر ہمارے اسلاف واخلاف نے بے شمار ضخیم کتب تصنیف کر رکھی ہیں اور اپنے تئیں ''علمِ قرأت'' کو فروغ دینے کی نیت سے ایسے ایسے دقیق نِکات پیش فرمائے ہیں کہ عقلِ اِنسانی ورطۂ حیرت میں غرق ہو ہو جاتی ہے۔ دوستو! یہ نکتہ کس درجہ عام فہم تھا کہ جب خود قرآن کہیں نہیں کہتا کہ اس کتاب کی ایک سے زائد قرأتیں ہیں، پھر ہمارے اکابر کو آخر اس موضوع پر اَن گنت تصانیف رقم کرنے کی ضرورت ہی کیا پڑی تھی؟

یہ جہت اپنی جگہ قابلِ توجہ ہے کہ علمی مسائل معتقدات کے مدار میں کیسے شامل ہو جاتے ہیں؟ اگر اختلافِ قرأت کا مسئلہ محض نظری یا علمی ہوتا تو شاید ایسی بڑی بات نہ تھی مگر ہمارے ہاں اسے باقاعدہ عقیدے کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ ہماری دانست میں قرآن کی ''عملی منسوخی'' میں دو بنیادی اعتقادات کا حصہ ہے۔ ہم ایک بار پھر کہیں گے کہ مسلمان کو قرآن سے دور کرنے میں دو عقیدوں نے اساسی کردار ادا کیا ہے اور وہ یہ ہیں:

1۔ قرآن مجید کی بعض آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔

2۔ قرآنِ مجید ایک سے زائد قرأتوں میں نازل ہوا تھا (قرأتوں کے نسخ کا عقیدہ اپنی جگہ طرفہ تماشا ہے!)

اچھا صاحبو! شروعات میں ہمارا نیک گمان یہی تھا کہ اکابرینِ اِسلام پر یہ محض اتہام ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے کسی حصے کو کوئی منسوخ قرار دے دے؟ نیز یہ کہے کہ بعض آیات قرآن مجید میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اس طرح تو پورے کے پورے قرآن کی معتبریت (CREDIBILITY) مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن بعد ازاں جب ہم نے اپنے بعض اکابر کی تحریریں خود پڑھیں تو یہ دیکھ کر نقشِ حیرت بن گئے کہ انہوں نے بڑے دھڑلے سے لکھا ہے کہ ہاں وحی کی ایک قسم وہ بھی ہے جو آپؐ پر اترنے

کے بعد نہ صرف اذہان سے محو کر دی گئی بلکہ جن کاغذوں پر اُسے لکھ لیا گیا تھا وہاں سے اسے کسی غیبی طریقے سے DELETE بھی کر دیا گیا (اور ایسی ''قرآنی وحی'' کے نمونے بطور ثبوت آج بھی موجود ہیں۔ یاللعجب!) اسی طرح وحی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آج بھی قرآنِ مجید کے صفحات میں موجود ہے لیکن ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس وحی کی صرف تلاوت ہوسکتی ہے (کیسی عجیب بات ہے (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے!) کہ ہم اللہ کے سامنے ان آیات کو پڑھتے ہوئے یہ یاددہانی بھی کرائیں گے کہ مولا! یہ آیات ہم یونہی ثواب کی غرض سے پڑھ رہے ہیں ان پر سیریس نہ ہوجانا۔) وحی کی تیسری شکل یہ ہے کہ وہ اتری تو بطور قرآن ہی تھی مگر ''بوجوہ'' وہ قرآن میں شامل ہونے سے رہ گئی۔ اس ''بوجوہ'' کا تعیّن بھی آج تک نہ ہوسکا' نہ اس کی حکمت سے اُمت کو آگاہ کیا گیا۔

گزشتہ دنوں فقیہہ العصر مفتی اعظم حضرت مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی (مفتی جامعہ اشرفیہ) کی تالیفِ لطیف ''فرضیتِ رجم'' کا ہم مطالعہ کر رہے تھے۔ جس میں حضرت صاحب موصوف نے ایک باب باندھا ہے؛ ''رجم کا ثبوت آیات سے۔'' اس کی ابتدائی سطور میں آپ فرماتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ رجم کا ثبوت صاف قرآنی لفظوں میں ایسا نہیں جیسا جلد (کوڑے مارنے) کا ہے مگر بہت آیات سے یہ ماخوذ تو ہے۔ بیس (20) پیش کی جاتی ہیں اور صاف حکم ہونے کا نکتہ آیت نمبر 2 میں عرض ہے۔'' (ص 11)

ہم نے بے صبری سے ''صاف حکم'' والی آیت نکالی کہ ہمارے ناقص علم کے مطابق رجم کا ''صاف حکم'' قرآن میں نہیں تھا۔ لیکن جب یہ آیت دیکھی تو یہ سورۃ نور کی وہ مشہور آیت تھی جس میں کوڑے مارنے کا حکم تھا۔ رجم کا اس میں کہیں شائبہ بھی نہیں ملا۔ البتہ ص 22 پر ہمیں ''صاف حکم'' والی آیت مل گئی۔ جو ترتیب کے اعتبار سے چار نمبر آیت ہے لیکن مرتبے کے لحاظ سے ''دو نمبر آیت'' ہے کہ موصوف مولانا (جو غالباً مرحوم ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے!) نے خود اس کے عربی متن کے نیچے قوسین میں یہ نوٹ لکھا ہے ''(منسوخ التلاوۃ' سورۃ احزاب میں تھی)۔''

اب ہمیں یہ تجسّس کہ آخر ایسی آیت جس کے حکم کو برقرار رکھنے پر حضرت عمرؓ تک مصر ہیں اور اس پر ''اجماعِ امت'' کی مقدس چھپی بھی لگی ہوئی ہے' آخر اس کے متن کو سورۃ احزاب میں رکھنے کے بعد خارج کیوں کر دیا گیا؟ اور ایسا کس نے کیا؟ ہم نے سوچا کہ مولانا کے اسمِ گرامی کے ساتھ ''تھانوی'' ایسا معزز لاحقہ موجود ہے' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے جدِ امجد کی تقلید میں ''احکامِ نقلیہ'' کے ''مصالح عقلیہ'' پیش نہ فرمائیں؟ اور ہم مایوس نہیں ہوئے کہ مولانا نے اس آیت:

> ''بڑا مرد اور بڑی عورت جب دونوں زنا کر لیں تو تم لوگ ضرور دونوں کو رجم کرو۔ اللہ کا عذاب قرار دے کر اور اللہ تعالیٰ غالب

ہیں حکمت والے ہیں۔''

کے بعد اس کی عقلی توجیہہ ''نقلی انداز'' میں یوں فرمائی:

''رہا یہ سوال کہ آخر محصن (شادی شدہ) کی سزا کیوں بیان نہیں فرمائی؟ تو علامہ سیوطی شافعی نے اتقان میں اس کا نکتہ لکھا ہے کہ آیت الشیخ والشیخۃ کی تلاوت کیوں منسوخ ہوئی؟ کہ یہ امت پر تخفیفِ عظیم ہے کہ اس کی تلاوت اور مصاحف میں کتابت سے شہرت نہ ہو اگرچہ اس کا حکم باقی رہے گا کہ یہ حکم ثقیل ترین اور سخت ترین اور اس کی حد بھی شدید ترین ہے۔''

آگے چل کر مولانا لکھتے ہیں:

''.....سخت ترین جرم کی سخت ترین سزا جو رجم ہے جس آیت میں اس کی تلاوت منسوخ فرمادی گئی اور دوسری آیتوں میں بھی صاف نہیں فرمائی گئی تا کہ قیامت تک کے لوگوں کے دنیا بھر میں سب سے زائد پڑھی لکھی جانے والی کتاب میں پڑھنے اور قرآنی نسخوں میں لکھے جانے سے اس کی شہرت نہ ہو اور اشرف المخلوقات میں سے خیر الامم میں ایسے واقعات ہونے کی شہرت سے ان کی بدنامی نہ ہو تو یہ اس امت پر رحم و کرم اور تخفیف وستاری فرمادی گئی ہے۔'' (ص10-9)

---

کہیے جناب! کیا سمجھے ہیں؟ یہ ہوتی ہے ''عقلی'' توجیہہ! بصد معذرت تمجال ہے جو خیر سے اس ''توجیہہ'' میں کہیں قرآنی معیارِ عقل کا گزر ہوا ہو۔ پہلا سوال تو یہ ہے' کیا اللہ تعالیٰ نے خود اسے ''وحیٔ متلو'' کے کھاتے سے نکال کر ''وحیٔ غیر متلو'' کے کھاتے میں درج کرایا؟ کیا رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایسا کرنے کا حکم دیا؟ کیا اس آیت کی سختی کو صحابہؓ نے محسوس کرتے ہوئے امت کے لیے ''تخفیف'' کا اہتمام کیا؟ صحابہؓ اور رسولِ اکرمؐ تو ذاتی حیثیت میں یقیناً کر نہیں سکتے تھے کہ آیت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں اور اس کی سختی اور ثقالت کو محسوس کرتے ہوئے وہ اسے قرآن سے خارج کر دیں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے حکم کو باقی رکھیں لیکن اس کی لفظی ادائیگی کو ممنوع قرار دے دیں۔ باقی رہے خود خدا' تو خدا سے ڈر کے کہتے ہیں' ہمیں قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں ملتی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو کہ سورۃ احزاب کی وہ رجم والی آیت جو میں عجلت میں پہلے بھیج چکا ہوں' اس پر عمل تو کیا کرو لیکن اس کی تلاوت نہ کیا کرو بلکہ اسے قرآن کے نئے ایڈیشن میں سے نکال دو۔

پھر ''تخفیف'' کا یہ انعام کس کی طرف سے ملا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آیت پہلے بھیج دی' سورۃ احزاب میں جگہ بھی پا گئی'

جب تک اس سورۃ میں موجود رہی تلاوت بھی ہوتی رہی' حتیٰ کہ عجیب وغریب روایات کے مطابق بکری اسے کھا گئی لیکن اس کے باوصف آیت رجم آج بھی اپنے مکمل متن سمیت موجود ہے۔قرآن میں نہ سہی' روایات کے خزینے میں سہی۔سب سے بڑھ کر اسے من وعن OWN بھی کیا جارہا ہے اور وقتِ ضرورت اسے پڑھا بھی جارہا ہے۔

''تخفیف'' کیا ہوئی؟ جب اس کے مطابق عمل ہوگا تو کیا سنگساری کی سزا کے نفاذ کو دیکھ کر عینی شاہدوں پر خوف طاری نہیں ہوگا؟ کیا رجم کی عملی صورت دیکھ کر وہ دہشت زدہ نہیں ہوں گے؟ ظاہر ہے سزا دی ہی اس لیے جاتی ہے کہ باقی عبرت حاصل کریں۔ جب مولانا صاحب خود اسے سخت ترین جرم اور اِس کی سزا (رجم) کو سخت ترین سزا دے رہے ہیں تو قانون کی اس شق کے مطالعے (تلاوت) سے آخر اُمت کو نقصان کیا ہونا تھا؟ خدا شاہد ہے کہ ہم بحث برائے بحث یہ سوالات نہیں اٹھا رہے ہیں۔اگر قرآن اور صاحبِ قرآن (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) سے سچا تعلق ہے تو کچھ غور کرو!

پھر اگر بعد میں ''تخفیف'' ناگزیر ہوگئی تھی تو اللہ تعالیٰ تو علیم مطلق ہیں' انہیں بعد میں جو اسے کینسل کرنا تھا' پہلے ہی نازل نہ کرتے.....اور پھر عمل بھی اس پر کرا رہے ہیں مگر ''حکم'' یہ ہے کہ اِسے قرآن میں سے نکال دو۔کون ان سوالوں کا جواب دے گا؟

نیز یہ وضاحت بھی فرما دی جائے کیا قرآن میں سے باقی انذاری آیات نکال دی گئی ہیں؟ یا اس پہلو سے قرآن کا جائزہ لیا جارہا ہے؟ یہ تو نام نہاد ''روشن خیالی'' کے ایجنڈے کا شاخسانہ محسوس ہورہا ہے کہ جن جن آیات سے عوام کو دہشت کا احساس ہوتا ہے' نیز قرآن کی شہرت متاثر ہوتی ہے' نئے ایڈیشنوں میں سے انہیں نکال دیا جائے۔

سرِ دست ہم صرف ایک آیت کا ترجمہ درج کررہے ہیں۔دِل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ اس آیت کے مطالعے (تلاوت) سے زیادہ دہشت ہوتی ہے یا (مزعومہ) آیۂ رجم سے؟

> ''جو لوگ اللہ اور رسولؐ سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں' ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیے جائیں یا سولی چڑھا دیے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیے جائیں یا ملک سے نکال دیے جائیں.....'' (سورۃ مائدہ آیت 32)

ویسے یہ مولانا مرحوم کا محض حُسنِ ظن تھا کہ یہ امت آیۂ رجم کی تلاوت سے خوفزدہ ہو جاتی لہٰذا اسے قرآن سے خارج کر دیا گیا۔حالانکہ جس طرح قرآن کی تلاوت ہوتی ہے' اس میں کسی کو کچھ پتہ چلتا ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ جس طرح قسموں/حلفوں کے وقت قرآن اٹھایا جاتا ہے کہ اس سے کسی کو معلوم ہوتا ہے اس میں کیا لکھا ہے؟ جس طرح یہاں (عموماً) تراویح میں قرآن پڑھا جاتا ہے کیا امام ومقتدی کو خبر ہوتی ہے کہ کس آیت کا کیا مفہوم ہے؟ جس طرح عاملین تعویذ لکھ لکھ کر آیات کو بیچ رہے ہوتے ہیں کیا اس کے

معانی جزوِشعور بنانا اس ''عملیات'' کے نصاب میں شامل ہوتا ہے؟ ذرا سروے کر کے بتایئے گا کہ کتنے فی صد نمازی' نماز کے متن کے درست ترجمے سے آگاہ ہیں؟ جب بِن سمجھے ہی آیات کی تلاوت سے ثواب کی بارشیں نازل ہونی ہیں تو اُن آیات کو قرآن سے خارج کیوں کر دیا گیا جو پہلے قرآن میں شامل تھیں؟ اس طرح تو امت ثواب[1] کے وسیع اثاثے سے محروم ہوگئی ہے۔ باقی لگتے ہاتھ یہ تصریح بھی کر دیجیے کہ جو ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں' ان میں سے کتنے ہیں جو خوفزدہ کر دینے والی' تعزیری اور انذاری آیات کی تلاوت سے دہشت زدہ ہو کر مر گئے ہیں؟ کسی پر ان کے مطالعے سے کپکپی ہی طاری ہوئی ہو؟ ہمارا تو المیہ ہی یہی ہے:

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیال روزِ جزا گیا

اے کاش! قرآن پڑھتے ہوئے کسی کا قلب گداز ہو جائے! اے کاش! ہمارے حکام تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے چھلک پڑیں۔ جس روز ایسا ہو گیا تبدیلی آجائے گی۔ اس انقلاب آفریں ساعت کی راہ میں ہماری سنگدلی ہی تو واحد رکاوٹ ہے کہ ہم نے قرآن کی آیات سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ اور مولانا (مغفور) ہیں کہ حد سے زیادہ رحم دِل ہوئے جا رہے ہیں کہ کسی طرح دہشت پھیلانے والی آیات کو قرآن کے سلیبس (SYLLABUS) سے خارج کرا دیں کہ اس طرح قرآن کی شہرت کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں (معاذ اللہ)!!!

---

پیارے قارئین! آج ہم ''ناسخ و منسوخ'' پر اظہارِ خیال کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ یہ تو محض تمہید تھی۔ ہم قرآن سے دوری کی دوسری بنیادی وجہ یعنی ''اختلافِ قرأت'' کے خطرناک عقیدے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ موضوع بھی اہم ہے اور ہمارا یہ مضمون بھی کم اہم نہیں ہے۔ اس کی ''اکلوتی'' اہمیت یہی ہے کہ اس مشکل تر SUBJECT کو ہم آسان ترین اُسلوب میں پیش کر رہے ہیں تا کہ عام قاری بھی اس کی معنویت سے آگاہ ہو جائے اور کسی طرح وہ کتاب اللہ سے پھر جڑ جائے۔

بطور پس منظر ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ اس حوالے سے ہم نے اپنے گردوپیش میں بے طرح پھیلے ہوئے صلحا سے استفسارات بھی کیے لیکن وہ صالحین حد سے زیادہ سادہ ثابت ہوئے کہ اس موضوع پر رسمی کلام ہی کر سکے۔ حالانکہ ہم انہیں کافی پڑھا لکھا سمجھنے کے گمان میں گرفتار تھے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک صالح نے فرمایا:

اختلافِ قرأت سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو سات مختلف لہجوں میں پڑھا جا سکتا ہے اور یہ صرف لب و

---

[1] ثواب کا قرآنی مفہوم مروج مطلب سے یکسر مختلف ہے۔

لہجے کا فرق ہے۔اس طرح قرآن کو پہلے بھی ان لہجوں میں پڑھا جاسکتا تھا۔آج بھی اس کی اجازت ہے اور یہ ادائیگی معانی میں قطعاً کوئی فرق نہیں ڈالتی۔ہم نے کہا' حضور! کہا یہ جاتا ہے قرآن سات قرأتوں میں ''نازل'' ہوا ہے اور ''نازل'' کے معانی آپ جانتے ہیں کہ قرآن اللہ نے سات قرأتوں میں نازل فرمایا ہے۔غصے میں آکر بولے، نازل کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے سات قرأتوں میں اتارا ہے۔اس نے ایک ہی طرح اتارا ہے۔ہاں سات عربی لہجے پہلے سے موجود تھے' انہیں اپنے اپنے لہجے میں پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔بس یہی ہے ''نازل ہونے'' کا مفہوم۔ہم نے عرض کیا؛ کیا اختلافِ قرأت میں لفظوں کا فرق بھی شامل ہے؟ طیش میں آگئے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ بھلا ایک سے زائد الفاظ چاہے وہ مترادف ہی کیوں نہ ہوں' کیوں کر بھیجنے لگا؟ اومیاں! صرف لب و لہجے کا فرق ہے اور وہ بھی معمولی۔بس اختلافِ قرأت سے یہی مطلب ہے۔

ہمیں ان کی سادگی پر ترس آیا اور بھولپن پر پیار! اسی طرح عربی کے ایک فاضل پروفیسر صاحب سے بھی اس حوالے سے پوچھا۔وہ بھی کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے بلکہ بڑی معصومیت سے فرمانے لگے کہ آپؐ پر وحی کا مفہوم ہی اترتا ہوگا' لفظ تو آپ کے اپنے ہی ہوں گے۔سو ان سے گفتگو آگے کیا بڑھتی؟ البتہ انہوں نے اگلے دِن ہمیں لبنان کے مصنف ڈاکٹر صُبحی صالح کی تصنیف ''علوم القرآن'' لاکر دے دی کہ اس مسئلے پر ایک چیپٹر ہے' پڑھ لو' ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ایک اور عربی دان' زہد و ورع کے مدعی اسلامیات کے معمر پروفیسر صاحب سے پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ''معارف القرآن'' کی پہلی جلد میں بڑی مفید معلومات درج ہیں' اس کا مطالعہ کرلو' انشاءاللہ شفا ہوگی!

قصہ مختصر اپنی ذہنی استعداد کے مطابق ہم نے یہ دونوں آرٹیکلز بالاستعیاب پڑھ ڈالے۔ہماری یہ مجمل سی تحریر درحقیقت انہی آرٹیکلز پر اجمالی تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے۔محولہ دونوں ہستیاں اختلافِ قرأت کے حوالے سے ''اقبالی'' ہیں۔یعنی وہ غیر مبہم الفاظ میں اقرار کرتے ہیں کہ ہاں قرآن مجید ایک سے زائد قرأتوں میں نازل ہوا تھا۔

ظاہر ہے اس مخصوص THESIS کی ایک اساس ہے اور یہ اساس خود قرآن مجید نہیں۔اس لیے کہ پورے قرآن میں اختلافِ قرأت کے حوالے سے کوئی اِشارہ بھی نہیں ملتا۔یہاں بھی DISPUTE وہی ہے:

## آیات vs روایات

ہمارے علما کو چونکہ متداول ''طرق واسانید'' ہمیشہ سے CONFUSE کرتے آئے ہیں فلہٰذا یہاں بھی انہیں بعض

روایتوں کی وجہ سے ہزاروں تاویلیں کرنی پڑی ہیں۔ اس ضمن میں روایات تو متعدد ہیں' تاہم بخاری شریف کی ایک روایت ایسی ہے جسے اس سلسلے میں لازماً QUOTE کیا جاتا ہے۔ پہلے ہم اپنے پاس موجود صحیح بخاری شریف کے نسخے میں سے وہ نقل کرتے ہیں:

''عروہ بن زبیر نے حضرت مسور بن مخزمہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے روایت کی کہ ان دونوں حضرات نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے حضرت ہشام بن حکم کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ میں سورۃ الفرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ جب میں نے ان کی قرأت سُنی تو وہ کتنے ہی ایسے حروف کے ساتھ پڑھ رہے تھے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز میں ہی ان پر حملہ کر دیتا لیکن میں نے صبر کیا' یہاں تک کہ انہوں نے سلام پھیر دیا۔ میں نے ان کی چادر ان کے گلے میں ڈال کر کہا کہ جو سورۃ میں نے آپ کو پڑھتے ہوئے سنا یہ آپ نے کس سے پڑھی ہے؟ کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ جس طرح آپ پڑھ رہے ہیں مجھے تو اس سے الگ انداز پر پڑھائی ہے۔ پس میں انہیں کھینچتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی طرف لے چلا۔ میں عرض گزار ہوا کہ میں نے انہیں سورۃ الفرقان ایسے انداز میں پڑھتے ہوئے سنا ہے جس طرح آپؐ نے مجھے نہیں پڑھائی۔ ارشاد فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو۔ اے ہشام! پڑھو۔ چنانچہ انہوں نے اُسی طرح پڑھی جیسے میں نے اُن سے سُنی تھی۔ چانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر! تم پڑھو۔ پس میں نے اسی طرح پڑھی جیسے مجھے پڑھائی تھی۔ فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے' بے شک قرآن مجید سات طریقوں پر نازل ہوا ہے۔ پس اسی طریقے سے پڑھو جس کے لیے جو طریقہ آسان ہے۔'' (جلد سوم' ص 907)

مذکورہ نزاع کا حتمی زمانی تعیّن کافی مشکل ہے۔ تاہم سورۃ الفرقان کب نازل ہوئی؟ یہ ایک حد تک معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ متذکرہ سورۃ مدنی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی تین آیات مدنی ہیں' باقی سورۃ مکہ شریف میں نازل ہوئی۔ جمہور کا مؤقف یہ ہے کہ سورۃ فرقان مکی ہے اور مکی دور کے آخر میں اتری۔ تاریخ بتاتی ہے حضرت عمرؓ نے نبوت کے چھٹے سال اِسلام قبول کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ مکہ کے سترہ پڑھے لکھے افراد میں شامل تھے۔ اس لیے یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ آیاتِ قرآنی سے ناواقف ہوں۔ چلیے مان لیا قبولِ اسلام سے پہلے وہ اختلافِ قرأت ایسی جزئیات سے آگاہ نہیں ہوں گے' لیکن آپؓ کے قبولِ ایمان کے کوئی

چھ برس بعد سورۃ فرقان نازل ہوتی ہے اور اس وقت تک جناب عمرؓ جیسا بالغ نظر، باریک بین اور جہاندیدہ شخص اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ قرآن سات مختلف قرأتوں میں نازل ہو رہا ہے۔

اگر حضرت عمرؓ یہ جانتے ہوتے تو کبھی حضرت ہشامؓ سے جھگڑا نہ کرتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نزولِ قرآن کے کم و بیش بارہ برس بعد حضرت عمرؓ جیسا خاص الخاص رفیقِ رسولؐ اتنی اہم بات سے یوں لاتعلق ہو؟ وہ عمر فاروقؓ جس کے متعلق یہاں تک کہا جاتا ہے کہ قرآن کی کئی آیات ان کی رائے کی تائید میں اتریں بلکہ ایک مقام پر یہ تک کہا گیا کہ قرآن کے صحیح مفہوم سے حضرت عمرؓ رسولِ کریمؐ سے بھی زیادہ آگاہ ہوتے تھے۔ جی جناب! ایک جانب ایسی مبالغہ آرائی اور دوسری طرف ایسی بے خبری! کوئی نکتہ ور ہی اس گرہ کو کھول سکتا ہے۔ باقی بھلے راوی کیسے ہی مستند کیوں نہ ہوں میرے رسولؐ قرآن کے خلاف کبھی نہیں جا سکتے۔

اب یہ توضیح بھی ناگزیر ہے کہ آخر سات قرأتوں سے مراد کیا ہے؟ سات قرأتوں کو ''حروفِ سبعہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے بھی صورتِ حال غیر معمولی ''باعثِ رحمت'' ہے کہ اُمت اس کی تعریف کے سلسلے میں ٹھیک ٹھاک اختلاف کا شکار ہے۔[1]

صبحی صالح لکھتے ہیں:

> ''حرف سبعہ کے معنی و مفہوم کی تعیین کے بارے میں علما نے مختلف و متضاد افکار و آرا کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ بعض علما نے اس ضمن میں پینتیس (35) اور بعض نے چالیس (40) اقوال ذکر کیے ہیں۔'' (علوم القرآن، ص 147)

پھر یہ بحث بھی مرکزِ تکلّم بنی کہ آیا سات سے مراد SEVEN ہے یا اس کا مطلب کثرت ہے؟ ظاہر ہے یہاں بھی غیر قرآنی علما دو فرقوں میں بٹ گئے۔ سوئے اتفاق! اتفاق یہ صرف کفر کے فتوے پر ہی کرتے ہیں یا دعوت سمرقند پر۔ لیکن یہ اگلے دِن پھر دعوتِ سمرقند پر ہی جمع ہوتے ہیں۔ فاقے کی تو کیا دعوتِ شیراز کی بھی نوبت نہیں آنے دیتے۔ الہم زد فزد!

ڈاکٹر صبحی صالح کا مؤقف ہے کہ سات سے مراد سات یعنی خاص عدد 7 مراد ہے جبکہ مرحوم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع علیہ الرحمۃ نے سات کے عدد میں قید ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ دس سے چودہ قرأتوں تک پہنچے ہیں۔ جس طرح روایات عجیبہ کی رُو سے نمازوں کی فرضیت کے وقت پچاس سے ہوتے ہوئے پانچ پر معاملہ طے پایا تھا۔ اسی طرح قرأتوں کے حوالے سے بھی ایک سے شروع ہو کر سات پر پہنچا گیا ہے۔ لیکن کیا ہے کہ آیات ایسی روایات کی تصدیق نہیں کرتیں۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے ''معارف القرآن'' کی جلد اوّل کے صفحہ 30 پر یہ روایت درج کی ہے:

> ''صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ایک مرتبہ بنو غفار کے تالاب

[1] میرے آقاؐ یگانگت کی پیاری تعلیم لے کر تشریف لائے تھے، اختلافات کو رحمت قرار دینے کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السّلام آ گئے اور انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں' میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے' پھر جبرائیل علیہ السّلام دوبارہ آپؐ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی امت قرآن کریم کو دو حرفوں پر پڑھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں۔ میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا کہ آپؐ کی امت قرآن کریم کو تین حرفوں پر پڑھے۔ آپؐ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں' میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی امت قرآن کو سات حروف پر پڑھے پس وہ ان میں سے جس حرف میں پڑھیں گے ان کی قرأت درست ہوگی۔''

مفتی صاحب مرحوم نے اس کی تائید کی ہے کہ قرآن کریم کی قرأتیں اللہ تعالیٰ نے خود نازل فرمائی ہیں۔ علامہ غلام رسول سعیدی نے ''تبیان القرآن'' کی جلد نمبر 8 کے صفحہ نمبر 204 پر لکھا ہے:

''حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی 852ھ لکھتے ہیں:

سات حروف میں قرآن مجید کو نازل کرنے کی حکمت یہ تھی کہ پڑھنے والے کے لیے آسانی ہو اور پڑھنے والا ایک لفظ کی جگہ اس کے مترادف کو پڑھ سکے خواہ یہ سات حروف ایک ہی لغت سے ہوں۔ کیونکہ حضرت ہشامؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کی ایک ہی لغت تھی اور وہ لغت قریش تھی۔ اس پر حافظ ابن عبدالبر نے متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے کہا سات حروف سے مراد یہ ہے کہ لغت قریش کے سات مترادفات تک قرآن مجید کو پڑھا جا سکتا ہے اور اکثر اہلِ علم کا یہی مختار ہے۔''

آگے چل کر سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر 4 درج کی گئی ہے۔

''ہم نے ہر نبی کو اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا ہے۔''

اس سے استنباط کرتے ہوئے دلیل لائی گئی ہے کہ اس کا تقاضا ہے کہ یہ تمام لغات قریش کے قبائل کی ہوں۔

اب گفتگو بڑے دلچسپ مرحلے میں داخل ہو رہی ہے کہ وضع کردہ روایات کے مطابق حضورؐ نے بار بار التماس کر کے اللہ تعالیٰ سے سات حروف کی اجازت حاصل کی۔ صرف اس لیے کہ امت ایک ہی حرف (قرأت) پر قرآن پڑھنے سے عاجز تھی۔ آپ

بتایئے کہ یہ عجز قبیلہ قریش میں زیادہ مسئلہ بن سکتا تھا یا دیگر قبائل عرب میں؟ یعنی غیر قریش پابند تھے کہ وہ قرآن کو قریشیوں کی لغت میں ہی پڑھیں (چاہے وہ اس لغت میں پڑھنے میں کیسی بھی دقت کیوں نہ محسوس کریں) لیکن خود قریشی سات مترادفات میں سے کسی کو بھی منتخب کرنے میں آزاد تھے۔

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کتنی عجیب بات ہے کہ جن کے لیے حقیقی مشکل تھی، ان کے لیے کوئی آسانی نہیں رکھی گئی اور جو اسے اپنی زبان کے کارن آسانی سے پڑھ سکتے تھے انہیں اجازت دے دی گئی کہ لو بھئی! ہم اس قرآن کو سات مترادف الفاظ میں اتار رہے ہیں، جس میں سہولت محسوس کرو پڑھ لیا کرو۔ خدارا! دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ کیا یہ روایات حضور نبی اکرمؐ سے محض منسوب نہیں ہیں؟ بھلا اس اختلاف کی اینٹ آپؐ اپنے ہاتھ سے کیسے رکھ سکتے تھے؟

دوستو! آپ کو لفظ ''مترادفات'' کے بار بار استعمال سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ''حروفِ سبعہ'' کی ایک INTERPRETATION بہرحال یہ بھی ہے کہ مفہوم کو تبدیل کیے بغیر متبادل الفاظ کے ذریعے ادا کیا جا سکتا ہے۔ سوال لوٹ کر پھر آتا ہے کہ کیا وہ سات مترادف الفاظ خود خدا نے اتارے تھے یا اس نے (چلیے قریش کو ہی سہی) خود صوابدیدی اختیار دے رکھا تھا کہ اس وحی ربانی کو اُن الفاظ سے پڑھ پڑھا لیا کرو جو تمہارے حساب میں آئیں؟

ایک جانب وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے اسے سات حرفوں پر اتارا ہے۔ دوسری طرف یہ روایات ہے:

''اے عمرؓ! قرآن میں ہر طرح کے الفاظ کا استعمال درست ہے بشرطیکہ تو رحمت کی جگہ عذاب او رعذاب کی جگہ رحمت کا لفظ نہ رکھ دے۔'' (تفسیر ابن جریر، جلد اوّل، ص 10)

اس روایات سے مترشح ہوتا ہے کہ الفاظ کا انتخاب قاری کی صوابدید پر مبنی تھا۔ اللہ نے ایک ہی حرف پر قرآن اتارا تھا۔ ان تضادات کو کون حل کرے گا؟

ڈاکٹر صبحی صالح تسلیم کرتے ہیں:

''یہ بات دلائل صحیحہ سے معلوم ہو چکی ہے کہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے آغازِ اسلام میں وسعت وسہولت کے پیشِ نظر مسلمانوں اور خاص طور پر بوڑھے مردوں اور عورتوں کو اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ قرآن کریم کو اپنی زبان کے مطابق پڑھ لیا کریں۔ اس لیے کہ دوسری زبان میں

پڑھنے سے مشقت کا سامنا ہوتا ہے۔'' (ص154)

اس کے آگے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے یہ معنی نہیں کہ آنحضورؐ ان کو اس بات کی اجازت دیتے تھے کہ ان قرأتوں کو قرآنی الفاظ کی طرح مصاحف میں لکھ لیں۔'' (ص154)

جناب علامہ غلام رسول سعیدی نے قاسم بن ثابت کے حوالے سے اس نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔

''اس طرح قرآن مجید کو پڑھنے کی رخصت اس وقت تھی جب قرآن مجید کو لکھا نہیں جاتا تھا اور اس کا رسم الخط متعیّن نہیں ہوا تھا۔'' (تبیان القرآن، جلد 8، ص205)

دوستو! اس سے یہ ثابت ہوا کہ سورۃ فرقان کے نزول کے وقت تک اس کی اجازت تھی بلکہ باقاعدہ اجازت اس وقت دی جارہی ہے۔ یعنی نزولِ قرآن سے گیارہ بارہ برس بعد تک قرآن تحریری صورت میں موجود ہی نہیں تھا؟ حالانکہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا جو واقعہ زیادہ مشہور ہے، اس کے تعلق میں بتایا جاتا ہے کہ ان کے بہنوئی نعیم ابن عبداللہ اور ان کی اہلیہ یعنی حضرت عمرؓ کی بہن جس صحیفے کی تلاوت کررہے تھے اس میں سورۃ طٰہٰ، سورۃ حدید اور دیگر سورتیں درج تھیں۔ سو یہ کہنا کہ یہ اجازت تب تھی جب قرآن ضبطِ تحریر میں آنا شروع نہیں ہوا تھا بالبداہت غلط ہے۔

آگے چلیے، پنبہ کجا کجا نہم! لوگ کب تک مختلف قرأتوں میں قرآن شریف پڑھتے رہے؟ مفتی محمد شفیع مرحومؒ سے پوچھتے ہیں:

''شروع میں چونکہ لوگ قرآنِ کریم کے اُسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے اس لیے ان سات اقسام کے دائرے میں بہت سی قرأتوں کی اجازت دے دی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبرائیل علیہ السّلام کے ساتھ قرآن مجید کا دورہ کیا کرتے تھے۔ جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ دورہ فرمایا۔ اس دور کو ''عرضۂ اخیرہ'' کہتے ہیں اس موقع پر بہت سی قرأتیں منسوخ کردی گئیں اور صرف وہ قرأتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔'' (معارف القرآن، جلد اوّل، ص32)

سبحان اللہ! ایک نہایت ثقہ عالم فرمارہے ہیں کہ ان قرأتوں کی اجازت ترقیمِ قرآن سے قبل تک تھی۔ دوسرے معتبر ترین عالم کا فرمان ہے کہ سالِ وصال نبیؐ میں جاکر ''بہت سی قرأتیں'' منسوخ ہوئیں۔ حالانکہ اس وقت مکمل قرآن ضبطِ تحریر میں آچکا تھا۔

پیارو! یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ مفتی صاحبؒ نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا کہ سالِ وفات میں بہت سی قرأتیں منسوخ ہوگئیں

اور جو باقی رہ گئیں وہ آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ ہیں یعنی ان کی اجازت ہے۔

ہم یہ پوچھتے ہیں پھر حضرت عثمانؓ نے جس ایک قرأت پر اُمت کو جمع کیا تھا' وہ کیا قصّہ تھا؟ اگر قرأتیں باقی ہیں تو حضرت عثمانؓ کو جو جامع القرآن کا کریڈٹ دیا جاتا ہے وہ کس بات پر ہے؟

یہ بھی ایک فلسفہ ہے' ایک سائنس ہے۔ مرحوم مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوتِ قرآن کے معاملے میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے اپنے عہدِ خلافت میں قرآن کے سات نسخے تیار کرائے اور ان سات نسخوں میں تمام قرأتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا کہ قرآن کریم کی آیتوں پر نقطے اور زیر وزبر پیش نہیں ڈالے تاکہ انہیں مذکورہ قرأتوں میں سے جس قرأت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں۔ اس طرح اکثر قرأتیں اس رسم الخط میں سما گئیں اور جو قرأتیں رسم الخط میں نہ سما سکیں' ان کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپؓ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قرأت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قرأت کے مطابق۔ امت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قرأتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علمِ قرأت ایک مستقل علم بن گیا۔'' (معارف جلد اوّل ص32)

اب سر پکڑ کا بیٹھ جایئے کہ ان تناظرات میں نکات ہی بڑے عجیب وغریب ترتیب پا رہے ہیں۔

(1) قرأتیں سات تھیں۔

(2) رسولؐ خدا نے خدا سے جھگڑ کر' منت سماجت کر کے سات کروائی تھیں وگرنہ قرأت ایک ہی تھی۔

(3) ان کی اجازت صرف اس وقت تھی جب تک قرآن لکھا نہیں جا رہا تھا۔

(4) اس سہولت سے صرف قریش مستفیض ہو سکتے تھے' غیر قریش قبائل نہیں۔

(5) محققین نے دوسرے قبائل کی لغت بھی قرآن میں دریافت کر کے دکھا دی ہے۔

(6) سال وفات بہت سی قرأتیں منسوخ ہو گئیں۔

(7) بہت سی قرأتیں منسوخ ہونے کے باوجود وہ سات کی سات رہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ساتوں قرأتوں کو ''ایک قرآن'' میں ضم کر دیا۔

(8) اور وہ ساتوں قرأتیں جب حضرت عثمانؓ سے ایک قرآن میں ضم نہ ہو سکیں تو آپؓ نے سات قرآن تیار کرائے۔ ہر قرآن الگ

قرأت میں تھا۔

(9) سات سے مراد سات ہی کا عدد ہے۔

(10) سات سے مراد کثرت ہے۔

(11) سات سے مراد قریش کے سات لغت ہیں۔

(12) سات سے مراد غیر قریش سمیت سات لغات ہیں۔

(13) سات قرأتوں سے مراد سات نوعیتیں ہیں۔

(14) سات قرأتیں صحیح سات قرأتوں کا محض ایک حصہ ہیں۔ ورنہ ہر وہ قرأت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اترتی ہو صحیح قابلِ قبول اور سات حروف میں داخل ہے جس پر قرآن کریم نازل ہوا۔

(15) سات سے مراد دس اور چودہ قرأتیں ہیں۔

(16) امام مازری کے بقول تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ ایک آیت کو اس جیسی دوسری آیت سے بدل کر پڑھنا حرام ہے اور جس نے کہا کہ غفور رحیم کو سمیع بصیر سے بدل کر پڑھنا جائز ہے۔ اس کا قول بھی فاسد ہے کیونکہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید کو متغیّر کر کے پڑھنا حرام ہے۔

اب امام صاحب سے کون پوچھے کہ آج متغیّر کر کے پڑھنا حرام کیوں ہے؟ اور اس وقت حلال کیوں تھا؟ آخر اس حرمت اور حلت کی کوئی علت بھی ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے اب کوئی یہ ہمت نہیں کرتا کہ وہ قرآن کے لفظوں کو دوسرے عربی لفظوں سے بدل کر اسے قرآن کہے! (ترجمے کی بات اور ہے کہ ترجمے کو ترجمہ ہی کہا جاتا ہے۔ اسے اصل قرآن کوئی نہیں کہتا۔ مارماڈیوک پکتھال' علامہ محمد اسد' احمد علی' مولوی محمد علی نے بہترین انگریزی ترجمے کیے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک! مگر اپنی ذات میں ہر ایک انگلش ٹرانسلیشن ہی ہے' قرآن نہیں کہ اصل قرآن اپنے عربی متن کے ساتھ ایک ہی ہے۔ ہمیشہ سے یہی تھا' ہمیشہ یہی رہے گا)۔

جملہ قارئینِ اختلافِ قرأت اسی طرف گئے ہیں کہ شروعات میں متبادل مترادف الفاظ میں قرآن پڑھنے کی اجازت تھی۔ پھر اس اجازت کو ختم کیوں کر دیا گیا؟ ہمارے اکثر علما نے اس اختلافِ قرأت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تفرقے کو مٹانے کا کریڈٹ حضرت عثمانؓ کو دیا ہے۔ لیکن اپنے حضرت مولانا مودودیؒ حضرت عثمانؓ سے سخت برافروختہ ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے کہ جو کام حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے نہیں کیا حضرت عثمانؓ نے کیوں

کیا؟ نیز جب ایسا کوئی حکمِ منسوخی خدا نے کبھی نازل نہیں کیا تھا تو حضرت عثمانؓ نے یہ STEP کیوں لیا؟ (مفہوم)

جن اصحاب کو اس موضوع سے دلچسپی ہے وہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ''علوم القرآن'' جناب علامہ غلام رسول سعیدی کی ''تبیان القرآن'' ڈاکٹر صبحی صالح کی ''علوم القرآن'' اور دیگر تفاسیر وغیرہ پڑھ لیں جس میں بڑے ہی رنگا رنگ گل کھلائے گئے ہیں۔ اور بالتفصیل مختلف قرأتیں بیان کی ہیں۔ یہاں ہم ڈاکٹر صالحی کو ضرور QUOTE کریں گے جنہوں نے اختلافِ قرأت کی سات اقسام بیان کی ہیں:

> ''سابقاً ذکر کردہ سات اقسام میں سے آخری قسم یعنی ''اختلافِ لہجات'' کی اہمیت کے پیشِ نظر بعض علما نے حروفِ سبعہ کو لہجہ کے مختلف اقسام میں محدود کر دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعض علما نے ازرہِ غفلت اس آخری قسم کا ذکر تک نہیں کیا..... ہمارے نزدیک یہ دونوں نظریات مبالغہ پر مبنی ہیں۔ یہ بات کسی طرح موزوں نہیں کہ سابقاً ذکر کردہ چھ اقسام کو اہم ہونے کے باوصف نظر انداز کر کے صرف ساتویں قسم کا ذکر کیا جائے۔ اسی طرح آخری قسم کی اہمیت مسلّم ہے..... لہٰذا آخری قسم کو نظر انداز کر کے باقی چھ اقسام کا ذکر کرنا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔'' (علوم القرآن، ص165)

ڈاکٹر صاحب غالباً نہیں یقیناً کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اختلافِ قرأت سات قسموں پر مشتمل ہے۔ وہ پارسا جو یہ کہتے ہیں کہ یہ محض لب و لہجے کا فرق ہے، بالکل ناانصافی سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح جو اس فرق کو فہرست میں سے سرے سے ہی خارج کر دیتے ہیں اور باقیوں پر زور دیتے ہیں، وہ بھی عدل کے منافی سوچ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا اپنا ایک اندازِ فکر ہے لیکن ہم اُن کی اس اعتبار سے تائید ضرور کریں گے کہ اب نیک گمان رکھنے والے صلحا نے پردہ پوشی کی عجیب فعلیت اختیار کر رکھی ہے کہ بڑی سہولت سے اتنا کہہ کر شانت ہو جاتے ہیں کہ اختلافِ قرأت کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو جناب! مختلف افراد کے لب و لہجے کا معمولی اختلاف ہے۔ وگرنہ اس سے الفاظ میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے نہ معانی میں کوئی تغیّر برپا ہوتا ہے۔

ہماری رائے میں یہ لیپا پوتی پروگرام ہے۔ حقائق سے آنکھیں چرانے کی اس سے بہتر مثال اور کہیں سے دستیاب نہیں ہوگی۔ آپ کو جب اقسامِ اختلافِ قرأت دیکھنے کا موقع ملے گا تو آپ ششدر رہ جائیں گے کہ آپ کو اسما کا اختلاف ملے گا۔ ظاہر ہے اس میں افراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث کا فرق نظر آئے گا۔ اسی طرح افعال کا اختلاف دکھائی دے گا۔ ایک قرأت میں صیغۂ ماضی ہے تو دوسرے میں مضارع۔ اعراب کا واضح فرق مل جائے گا۔ الفاظ کی کمی بیشی کا فرق تو عام ہے۔ کبھی متبادل و مترادف الفاظ کے کارن

معانی ومفہوم میں خاص تبدیلی پیدانہیں ہوتی اور کبھی مفاہیم ومعانی یکسر بدل جاتے ہیں۔تقدیم وتاخیر کا فرق بھی موجود ہے۔لہجے کا فرق تو ''عام سی بات'' ہے۔حروفِ جارہ وعاطفہ کسی قرأت میں محذوف ہوجاتے ہیں تو کسی قرأت میں باقی دکھائی دیتے ہیں۔اوران گھمبیر اختلافی صورتوں کے خود وہ مکرم اصحاب قائل ہیں' جنہیں قرأتوں کا تنوع بیحد ہانٹ کرتا ہے مگر مجبوراً آج وہ ایک قرأت والے قرآن کو قبول کیے ہوئے ہیں۔

یاد آیا ڈاکٹر صبحی صالح نے کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ حرفِ سبعہ سے سات قرأتیں مراد نہیں۔ان کی نظر میں احرفِ اسبعہ اور چیز ہیں' سات قرأتیں مختلف شے ہیں۔ان کے خیال میں سات قرأتوں کا چرچا دوسری صدی ہجری کی شروعات میں ہوا۔ڈاکٹر صاحب مزید تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرأتیں سات نہیں' دس سے چودہ تک ہیں۔سات قرأتوں اور حروفِ سبعہ میں خطِ امتیاز کھینچتے ہوئے وہ اتنی گہرائی میں چلے گئے ہیں کہ عام ''قاری'' کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ موصوف کہنا کیا چاہتے ہیں اور ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

ہم بار دگر عرض کریں گے کہ جس نظریے کی متعیّن تعریف ڈیڑھ ہزار برس میں نہیں ہوسکی' اسے عقیدے کا درجہ دے دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ یعنی ان چودہ پندرہ صدیوں میں یہ تک طے نہیں ہوسکا کہ ''اختلافِ قرأت'' سے مراد کیا ہے؟ طُرفہ تماشا ہے کہ نہیں اس نزاع کو'' کفر اسلام'' کا مسئلہ بنالیا گیا ہے۔ایسے میں قرآن اور صاحبِ قرآن سے قلبی محبت رکھنے والا اگر یہ کلمہ زبان پر لے آئے قرأتوں کا اختلاف محض شاخسانہ ہے' نرا افسانہ ہے' قرآن پہلے دن سے ایک ہے اور قیامت تک یہ INDEFEASIBLE رہے گا تو اپنے جملہ اختلافات بھلا کر آنِ واحد میں سب اس صادق محبّ کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائیں گے کہ ہاں ہاں! تم ہوتے کون ہو ''مسلّمات'' سے انحراف کرنے والے؟

آپ کو یاد ہوگا ہم نے شروعات میں یہ عرض کیا تھا کہ ایک ''قرآن'' اصل قرآن سے باہر ہے۔یاروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دیکھ لیا لیکن اس مزعومہ قرآن کو وہ حقیقی قرآن کے صفحوں میں تادمِ ایں جگہ نہ دے سکے۔اللہ قرآن کا محافظ ہے۔یہ حفاظت کیا کسی معجزے سے کم ہے؟ یہ مضمون تشنہ رہے گا' اگر ہم بطور نمونہ چند قرأتی آیات کا یہاں اندراج نہ کریں۔یقیناً ایسی آیات کتبِ روایات میں اور بھی ہیں جن میں منسوخ وغیر منسوخ سب شامل ہیں۔اب کس کس ستم کا رونا روئیں؟ یہ لوگ اس حد تک چلے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود ہی مختلف قرأتوں میں اپنی آیات نازل کیا کرتا تھا' پھر حالات وواقعات کے مطابق ان کی قرأتوں کو منسوخ بھی کر دیا کرتا تھا اور ہمارے روایت پرست بھائیوں نے اللہ کی منسوخ کردہ قرأتوں کو آج تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے کہ کیا عجب کب ان کی ضرورت پڑ جائے یا بالفاظ دیگر:

تا کہ سندر ہے اور وقتِ ضرورت کام آئے

# فرق تلاش کریں

| قرآنی قرآن | اصل قرآن |
|---|---|
| (1) وَمَآ اَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَانَبِیٍ وَلَا مُحَدَّثٍ..... (بخاری شریف + اُصول الکافی)' (قرأت حضرت ابن عباسؓ) | (1) وَمَآ اَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَانَبِیّ..... (22/52) (حضرت ابنِ عباسؓ سے منسوب قرأت کو اگر ''صحیح قرآن'' تسلیم کرلیا جائے یعنی متن میں ''محدَّث'' کو بھی شامل سمجھا جائے تو ''اجرائے نبوت'' کے لیے مزید کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ کی تصنیف ''ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت'') |
| (2) فَمَااسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلیٰ اَجَلٍ مسّمی (قرأت ابنِ عباسؓ) | (2) فَمَااسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ (4/24) (اگر ''الیٰ اجل مسمّٰی'' کا قرآنی آیت میں اس روایت کے تحت اضافہ کرلیا جائے تو قائلین متعہ کو ناقابل تردید جواز مہیا ہوجائے گا.....اب آپ خود غور کر لیجیے کہ اختلافِ قرأت کا عقیدہ کس درجہ خطرناک ہے۔ اسے ''محض لب ولہجہ'' کا اختلاف قرار دینے والے حد سے زیادہ بھولے ہیں یا پھر ضرورت سے زیادہ شاطر! تاہم حسنِ ظن کا نجیبانہ تقاضا یہی ہے کہ اس سوچ کو سادگی سے ہی تعبیر کیا جائے)۔ |
| (3) وَلَایُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّ لَا شَهِیْدٌ | (3) وَلَایُضَآرَّ کَاتِبٌ وّ لَا شَهِیْدٌ (2/282) |
| (4) تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ | (4) تَمَّتْ کَلِمٰتُ رَبِّکَ |
| (5) رَبُّنَا بَاعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا | (5) رَبَّنَابَاعِدْبَیْنَ اَسْفَارِنَا(34/19) |
| (6) وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِکُمْ وَاَرْجُلِکُمْ..... | (6) وَامْسَحُوْابِرُؤُسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ..... (5/6) (اس مشہور آیت کا ''قرأتی ورژن'' ہم نے محترم |

مولانا محمد انور گنگوہی کی ''مشکلات القرآن'' سے QUOTE کیا ہے۔موصوف نے''دفع تعارض'' کے ضمن میں ایک''مسکت''جواب یہ بھی ارشادفرمایاہے:

''قرأتِ ثانیہ قرأتِ اولیٰ سے منسوخ ہے۔ابتدا میں مسح رجلین کا حکم تھا۔پھر یہ حکم منسوخ ہوگیااور غسلِ رجلین کا حکم دے دیا گیا۔**ولا تعارض بعدالنسخ۔**''

اس جواب کالاجواب ٹکڑا یہی ہے۔''**ولا تعارض بعد النسخ!**''اورحضرت صاحب نے اپنے اکابر کی تقلید میں اس فارمولے کورَجھ کے برتا ہے۔کتنی عجیب بات ہے! قرآن کہتا ہے کہ یہ کلام اگر اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو تم اس کی آیات کو باہم متعارض پاتے۔اب عملاً ہوا کیا کہ باہم متضاد ومتعارض متعدد آیات نکل آئیں۔سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ کیا کیا جائے؟ایک طرف اللہ میاں کا اتنا بڑا دعویٰ، دوسری جانب کھلا کھلا تضاد۔پھر ان عقلمندوں نے سوچ سوچ کر پائیدارحل یہی ڈھونڈا

''**ولاتعارض بعد النسخ**''

یعنی جو دو آیتیں آپس میں ٹکراتی ہیں ایک کوکینسل کردو۔اب کوئی کر کے دکھائے اعتراض کہ قرآن میں تضاد ہے؟

اتنا نہ سوچا کہ تضاد کی تعریف ہی یہ ہے کہ دو بیانات آپس میں متصادم ہوں۔ایک بیان پر کبھی تضاد کا الزام عائد ہو ہی نہیں سکتا۔جب قرآن کے بیانات آپس میں ملے ہی نہیں تو تضاد کا اعتراض تو اپنے آپ VALID ثابت ہوگیا۔

اب کیا اسے ''دفع'' کرنے کی یہی ترکیب رہ گئی تھی کہ ایک کو ''کاٹا ہوا'' قرار دے کر جان چھڑالی جائے؟ حالانکہ قصہ تو اتنا ہی ہے کہ دو ترجمے آپس میں ٹکراتے تھے نہ کہ آیات۔ اللہ کے بندو! ذرا غور کر کے اپنے تراجم ٹھیک کر لیتے۔ آیات کے مطابق کر لیتے تاکہ اس ''عذرِ گناہ'' کے لمبے چوڑے چکر میں الجھنا ہی نہ پڑتا۔ پر وہ بھی کیا کریں، ''روایات'' مزاحم ہیں۔ خانہ ساز روایات کو چھوڑتے ہیں تو عظیم الشان ادارے ہاتھ سے جاتے ہیں اور کون بے عقل اپنی روزی روٹی اور سیاسی ساکھ پر لات مارتا ہے؟)

| | | | |
|---|---|---|---|
| (7) | فَتَلَقّٰی اٰدَمَ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمَاتٌ | (7) | فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ ربِّہٖ کَلِمَاتٍ (2/37) |
| (8) | وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَ مَانَتِھِمْ | (8) | وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَ مَانَاتِھِمْ (23/8) |
| (9) | وَیَضِیْقَ صَدْرِیْ | (9) | وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ (26/13) |
| (10) | وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُشِزُھَا | (10) | وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُھَا (2/259) |
| (11) | کَالصُّوْفِ الْمَنْفُوْشِ | (11) | کَالعِھْنِ الْمَنفُوْشِ (101/5) |
| (12) | طَلْعٍ مَنْضُوْدٍ | (12) | طَلْحٍ مَنْضُوْدٍ (56/29) |
| (13) | فَیُقْتَلُوْنَ وَیَقْتُلُوْنَ | (13) | فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ (9/111) |
| (14) | اَمِ المسیطرون | (14) | اَمْ ھُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ (52/37) |
| | | | (اگر قرآن میں 'ص' ہے تو پھر یہی صحیح ہے)۔ |
| (15) | وَجَآءَ تْ سَکْرَۃُ الحَقِّ بِالْمَوْتِ | (15) | وَجَآءَ ت سَکْرَۃُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ (50/19) |
| (16) | جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مَنْ تَحْتِھَاالانْھَارُ | (16) | جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَھَاالَانْھَارُ (9/100) |

(ڈاکٹر صبحی صالح نے اپنی ''علوم القرآن'' کے

صفحہ 159 پرصحیح آیت کے ضمن میں بھی ''جَنّٰتٌ'' لکھا ہے' جوصحیح نہیں ہے۔قرآن مجید میں ''جَنّٰتٍ'' ہے۔اسی طرح ''الانہار'' بھی عموماً ''اَلْاَنْہٰرُ'' ضبطِ املا میں آیا ہے)۔

| | |
|---|---|
| (17) وَالذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی | (17) وَمَاخَلَقَ الذَّ کَرَوَالْاُنْثیٰٓ (92/3) |
| (18) وَکَانَ اَمَامَھُمْ مَلِکٌ یَّا خُذُ کُلّ سَفِینَۃٍ صَالِحَۃٍ غَصْبًا | (18) وَکَانَ وَرَآءَھُمْ مَّلِکٌ یَاخُذُ کُلَّ سَفِیْنَۃٍ غَصْباً (18/79) |
| (19) حَافِظُوْا عَلَی الصّلَوَاتِ وَالصّلاۃِ الْوُسْطی والصَّلٰوۃِ الوُسْطٰے صَلٰوۃ الْعَصْرِ | (19) حٰفِظُو اعَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الوُسْطیٰ (2/238) |

صاحبِ ''علوم القرآن'' نے اس قرأتی آیت کو اسی طرح لکھا ہے' ''البرہان'' (جلداوّل' ص 215) کو مزید توثیق کے لیے دیکھا جاسکتا ہے۔

| | |
|---|---|
| (20) وَامَّااَ لغُلَامُ فَکَانَ اَبَوَاہُ مُؤْ مِنِیْنِ کَافِرًا | (20) وَاَمَّا الغُلٰمُ فَکَانَ اَبَوٰہُ مُؤْ مِنَیْنِ (18/80) |
| (21) وانـذر عشیر نک الاقربین ورھطک منھم المخلصین | (21) وَاَنْذِرْ عَشِیْرَ تَکَ اْلَاَ قْرَ بِیْنَ (26/214) |

دوستو! بطورِنمونہ ہم نے اس کالم میں چند آیات کا حوالہ دے دیا ہے۔واضح رہے قرأتی آیات (جعلی آیات) کی تعداد اتنی ہی نہیں ہے۔کتبِ اسلاف خیر سے اس خزانے سے بھری ہوئی ہیں۔اور کچھ نہیں تو ''کتاب المصاحف'' (مرتّبہ ابوبکر عبداللہ بن ابی داوٗدؒ) کا ہی مطالعہ کر لیجیے' چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔مختصر یہ کہ روایات کے عظیم اثاثے سے اگر نیک نیتی سے استفادہ کیا جائے تو موجودہ قرآن کے مقابل ایک متوازی قرآن بسہولت تیار کیا جاسکتا ہے۔[1]

[1] اس مرحلے میں یہ توضیح بے محل نہ ہوگی کہ قرآنِ مجید کے سٹینڈرڈ نسخ سے جو نسخ مختلف تھے وہ معمولی مختلف نہیں تھے۔مثال کے طور پر حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ ''کا'' قرآن 1322 جگہ حضرتِ عثمانؓ ''کے'' قرآن سے مختلف ہے۔حضرت ابی بن کعبؓ کے مصحف میں 952 مقامات پر اختلاف ہے۔حضرت علیؓ کے مصحف میں 89 جگہ اختلاف ہے۔حضرت ابنِ عباسؓ کے مصحف میں 186 جگہ اختلاف ہے۔ام المومنین حضرت حفصہؓ اور دیگر امہات المومنینؓ 10 جگہ اختلاف کی نشاندہی کرتی ہیں۔حضرت انس بن مالکؓ کے مصحف میں 24 مقامات پر اختلاف پایا جاتا ہے۔حضرت عمرؓ جس مصحف کو اپنے پاس رکھتے تھے وہ 28 جگہوں پر مختلف تھا۔حضرت ابنِ زبیرؓ کے مصحف میں اختلافی صورت 34 آیات میں ظاہر ہوتی ہے۔(ماخذ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ حج صفحہ نمبر 210)۔

یہاں ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ ان کبار صحابہؓ کے مصاحف میں اصل قرآن سے قطعاً کوئی فرق نہیں تھا۔یہ مختلف مصاحف ان جلیل القدر ہستیوں سے یقیناً غلط طور پر منسوب ہیں۔مگر صد افسوس کہ ہمارے جید علمائے کرام نہ صرف اس گھمبیر اختلافی صورت کو Own کرتے ہیں بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ اختلاف ہے ہی نہیں کہ قرآن ان سب صورتوں میں نازل ہوا تھا۔

کیا عجب کہ ہمارے ''مومن بھائی'' ٹھیک ہی کہتے ہوں کہ اصل قرآن ستّر (70) گز کا تھا اور اس نسخے میں سترہ ہزار (17000) آیات تھیں۔ یہ الگ بات کہ وہ ''غائب قرآن'' کو ہنوز ''حاضر'' نہیں کر سکے ہیں۔ جس طرح قرائتی قرآن روایات کے شانوں پر سوار صدیوں سے ادھر اُدھر منڈلا رہا ہے لیکن اصل قرآن کے صفحوں میں داخل ہونے کا شرف ابھی اسے حاصل نہیں ہو سکا ہے.....ہم پھر کہیں گے کہ حفاظتِ قرآن کے زندہ معجزے کا دِن رات مشاہدہ کیجیے۔

البتہ ''حیاتِ رسولِ اُمیؐ'' ایسی وقیع تصنیف کے مصنف جناب خالد مسعود نے یہ افسوسناک خبر سنائی ہے:

> ''تیرہ سو برسوں تک کسی نے کسی دوسری قرأت پر قرآن شائع کرنے کی جسارت نہیں کی۔ مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں پہلی مرتبہ 1930ء میں مصر میں ورش عن نافع کی قرأت پر قرآن شائع کیا گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سوڈان میں 1978ء میں الدوری عن ابی عمرو اور 1981ء میں تیونس میں قالون عن نافع کی قرأت پر قرآن شائع ہوئے۔ یہ قرأتیں شمالی اور مغربی افریقہ کے بعض حصوں میں رائج ہیں۔ باقی تمام اسلامی دنیا کا قرآن وہی ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔'' (ص539)

یہ تحقیق کا مسئلہ ہے کہ مذکورہ ''مختلف قرآن'' کے نسخے حاصل کیے جائیں اور پھر تقابل کر کے دیکھا جائے کہ اصل قرآن سے کس قدر فرق ہے؟ نیز اس کے مرتّبین نے کس اساس پر اتنی بڑی جسارت کی ہے؟ باقی قرأت کے باب میں اس نوعیت کی ''جرأت'' کو راقم زیادہ سے زیادہ گستاخی کی ایک کامیاب کوشش قرار دے سکتا ہے۔ آخر خدا کی جانب سے حفاظت کے وعدے کے باوجود کئی بدبخت ایسے بھی گزرے ہیں جو قرآن مجید کے نسخوں کو بری نیت سے جلانے میں ''کامیاب'' رہے ہیں۔ لیکن ایسی ناپاک مساعی سے کیا دنیا سے قرآن اُٹھ گیا؟

آج اگر کوئی اپنی مرضی سے موجودہ قرآن سے ہٹ کر قرآن ترتیب دے لے تو کیا قرآن کی حفاظت مشکوک ہو جائے گی؟ فرق تو بس اتنا ہی ہے نا کہ کتبِ روایات میں ''قرائتی قرآن'' پہلے سے موجود ہے۔ اگر یہ ان کتابوں میں محفوظ چلا آ رہا ہے تو اب زیادہ سے زیادہ یہی ہوا ہے نا کہ اسے کسی ظالم نے اپنے مذموم مقاصد کی خاطر جمع کر کے چھاپ دیا ہے۔ بس!.....ہم پوچھتے ہیں کہ اس کارروائی سے کیا حقیقی قرآن کی وقعت مظنون قرار پا گئی؟

آج اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کر ڈالے حتیٰ کہ اس کا ادعا یہاں تک پہنچ جائے کہ (معاذ اللہ) میں محمد ہوں تو کیا اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی رسالت اور شخصیت (خاکم بدہن) ABOVE BOARD نہیں رہے گی؟ اس دنیا میں جھوٹے مدعیانِ نبوت کی ایک طویل فہرست ہے۔ حتیٰ کہ خدائی کے دعویداروں کا بھی ایسا قحط نہیں ہے۔ اگر کوئی بدباطن ''نیا قرآن''

بھی لے آتا ہے تو کیا اصل قرآن کو اپنی بقا خطرے میں محسوس ہوگی؟

ہم نے جو یہ عرض کیا تھا کہ ''قرأتی قرآن'' اصل قرآن میں شامل داخل نہیں ہوسکا تو اس پس منظر میں ہی کہا تھا کہ وہ ایسا کبھی کر نہیں سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ قرآن کی حفاظت خدا کا ذمہ ہے اور وہ اپنی ذمہ داری سے کبھی غافل نہیں ہوسکتا۔ اور خدا اپنے محافظ ہونے کا حق ایسے جعلی قرآنوں کی موجودگی میں بھی ادا کرسکتا ہے اور کرتا ہے اور قیامت تلک کرتا رہے گا۔

---

لیکن صاحبو! ہم اُمتِ محمدیہؐ سے منسوب ہوتے ہیں۔ ہماری بھی کوئی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ کیا ہماری یہی ذمہ داری ہے کہ ہم خوشبودار کپڑے پہن کر منبر پر کھڑے ہوکر دِن رات یہی تبلیغِ ہدایت کیا کریں کہ قرآن یہ نہیں' اصل قرآن قرأتی قرآن ہے۔ اور قرآن سات/ دس/ چودہ قرأتوں میں نازل ہوا تھا۔ اور پھر اس دعوے کو صادق ثابت کرنے کے لیے دشمنوں کی گھڑی ہوئی روایات کے خزانۂ عامرہ کا منہ کھول دیا کریں' پھر تاریخ کے بے سند ذخیرے کے زور پر اختلاف قرأت کو اُمت کے لیے باعثِ رحمت گردانا کریں؟ یہ تو قرآن سے وفا ہے نہ صاحبِ قرآن (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) سے۔

یاد رکھیے! قرآن مجید کا جامع خود خدا ہے۔ اُس نے حرف بحرف ہی نہیں' انہی اعراب کے ساتھ اپنے آخری رسولؐ اور نبی حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سچے سینے پر اتارا تھا۔ آپؐ قرآن کے حافظ بھی تھے اور محافظ بھی۔ منصبِ رسالت کا اوّلین فریضہ قرآن مجید کی نشر واشاعت تھا اور آپؐ نے اپنی حیاتِ مبارک میں یہ اس طرح ادا کیا کہ صحابہؓ کی ایک کثیر جماعت کو قرآن مجید یاد کرادیا۔ اسی طرح چالیس کے قریب معتبر کاتبوں کے پینل کے ذریعے اس آخری آسمانی صحیفے کا متن کاغذ پر لکھوا دیا۔ جب آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو قرآن نہ صرف کتابی صورت میں جمع ہو چکا تھا بلکہ دور دراز تک اسے پہنچا بھی دیا گیا تھا۔ پھر آپؐ کی پیروی میں خلفائے راشدینؓ نے بھی قرآن مجید کی نشر واشاعت کا فریضہ بہ دِل وجان ادا کیا۔

پہلا نسخہ جو حضورؐ نے اپنی نگرانی میں تیار کرایا وہ معمولی سے اختلاف کے بغیر من وعن وہی تھا جو آج ہر گھر میں موجود ہے۔ یہی ترتیب' یہی متن' یہی اعراب' یہی نقطے.....سب کچھ یہی تھا۔ قرأتوں کا اختلاف خالص افسانہ ہے۔ سوچی سمجھی سازش ہے۔

دشمنوں نے اس کتاب کی حیثیت کو تشکیک وارتیاب کا مرکز بنانے کے لیے چال چلی کہ یہ سات مختلف متون میں نازل ہوا تھا اور ہم سادہ خاطر ان کے ساتھ ہو لیے۔ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے خدا سے جس طرح قرآن وصول کیا تھا' اسی طرح یہ امانت اپنی اُمت کے سپرد کردی۔ آپؐ نے اس کے متن میں ایک حرف کا فرق نہیں آنے دیا۔ آپؐ نے اس کے مفاہیم پر آنچ نہیں آنے دی۔ لیکن ہم وہ بدنصیب ہیں کہ آج تلے ہوئے ہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن کے الفاظ محفوظ ہیں نہ اس کے معانی! ہر کسی نے اپنی اپنی تعبیر' اپنی اپنی تفسیر کر رکھی ہے۔ لے دے کے اس کا متن اصلی حالت میں موجود ہے۔ مگر ہم مصر ہیں کہ نہیں جناب!

یہ اس طرح نازل ہی نہیں ہوا تھا۔ ہے کسی کے پاس اس ضد کا علاج؟

اس آخری مرحلے میں ایک نہایت سادہ سوال ہم ضرور پوچھیں گے، آخر مختلف قرأتوں کی کیا ضرورت تھی؟ روایت کے مطابق رسولِ کریمؐ نے درمیانی واسطے جناب جبرئیلؑ سے قیل وقال کر کے اللہ تعالیٰ سے خصوصی اجازت حاصل کی۔ اسی لیے نا کہ اُمت کے لیے آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ مفہوم قرآن کا وہی رہے، جو الفاظ جس کو میسر آتے ہیں، پڑھ لیا کرے۔ اس حساب سے پھر قرأت تو ایک ہی ثابت ہوئی۔ ''کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں۔'' پر ثقہ صالحین یہاں بھی کب رک سکے؟ انہیں تو اس عقیدے سے تشفی ملی کہ محولہ رعایت کے حصول کے بعد قرآن سات قرأتوں میں ''نازل'' ہوا ہے، جس کو جو SUIT کرتا ہے رکھ لیتا ہے۔

اچھی بات! لیکن کون نہیں جانتا کہ جب قانون کی کتاب کے اتنے متنوع متون ہوں گے تو گھمسان کا وہ رَن پڑے گا کہ الامان! الحفیظ! اور روایات کے مطابق عہدِ عثمانیؓ میں اس نزاع پر تلواریں نیاموں سے نکل آئیں۔ جبھی تو راویوں کے بقول ایک قرأت پر اتفاق کے لیے انہیں باقاعدہ STRATEGY بنانا پڑی۔

کسی قدر عجیب بات ہے کہ امت میں تفرقہ اس وقت ڈالا گیا جب ابھی چند ماننے والے تھے اور جب لاکھوں کروڑوں میں ہو گئے تو پھر فکر پڑ گئی کہ انہیں ایک قرأت پر کیسے متفق کریں؟ یہ تو ایسے ہی ہے کہ لوگوں سے شروعات میں یہ کہہ دیا جائے، میاں! جیسے جی چاہتا ہے نماز پڑھ لیا کرو، وقت کی کوئی قدغن ہے، نہ تعداد کا کوئی تعیّن ہے، رخ کی بھی کوئی پابندی نہیں ہے، امام، مسجد بھی ناگزیر نہیں ہیں، وضو کی بھی کوئی شرط نہیں ہے، پاکی ناپاکی بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے، متن کے سلسلہ میں بھی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ جو من میں آئے کرو کہ اصل مطلوب تمہاری آسانیاں ہیں۔ جب من مانیاں عملاً وجود میں آ جائیں، سارا ڈسپلن غارت ہو جائے تو پھر لٹھ پکڑ کر نیل کے ساحل سے لے تا بخاکِ کاشغر انہیں ایک نماز پر متحد کرنے کی مساعی شروع کر دی جائے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس اختلافِ قرأت کے قصے کو آپؐ کی عظیم ذات سے منسوب کیا جاتا ہے۔

دراصل ان قائلینِ اختلافِ قرأت نے قرآن مجید کو (معاذ اللہ) جنتر منتر کی کتاب سمجھ لیا کہ مقصد محض ریڈنگ ہے، ثواب ہی لینا ہے۔ تلفظ جو مرضی ہو، الفاظ کچھ بھی ہوا کریں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر ثواب بھی کون سا کوئی محسوس اجر ہے۔ ان کے ہاں یہ موصوف اللہ میاں سے بھی بڑھ کر ABSTRACT واقع ہوئے ہیں۔ قرآن خوانی کا ثواب اگلے جہان میں جا کر کچھ ملنے والا ہے۔ لہٰذا انہیں اختلافِ قرأت کے عقیدے سے واقعتاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اب انہیں کون بتائے قرآن اس دنیا کا آخری دستور ہے۔ آسمانی آئین پر مشتمل یہ آخری انعام ہے۔ اس کے بعد قانون کی کوئی کتاب نازل نہیں ہونی۔ اِنسانیت کا یہ آخری سہارا ہے۔ یہ حصولِ ثواب کے لیے اتری ہوئی کوئی ''رتن مالا'' نہیں ہے۔ نہ اس میں جادو کے طریقے درج ہیں۔ یہ ٹونوں ٹوٹکوں کا کوئی مجموعہ نہیں ہے۔ یہ عملیات کا بے معنی دفتر بھی نہیں ہے۔ یہ تعویذات کا خزانہ بھی نہیں ہے۔ یہ فال نکالنے والا کوئی دیوان بھی نہیں ہے۔

یہ تو اِنسان کو اِنسان بنانے والی، بہترین معاشرہ تخلیق کرنے والی، قوانینِ خداوندی کا درک عطا کرنے والی، کائنات کو تسخیر کرنے پر آدم کو آمادہ کرنے والی ایک نہایت خوبصورت رہنما کتاب ہے۔ جس میں کنکریٹ اُصول، ٹھوس حقیقتیں، سرمدی سچائیاں، ابدی صداقتیں غیر مبہم اور دوٹوک انداز میں درج ہیں۔ جن کی صد فی صد درست تعبیر سے ہی سیاسی، سماجی، عسکری، تعلیمی، اخلاقی اور معاشی انقلابات کا منظر نامہ ترتیب پاتا ہے۔ اس لیے اس میں معمولی سی بھی لفظی تحریف صدیوں کو گم کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ لے سانس بھی آہستہ.....

نیز یہ کہاں کی اور کیسی آسانیاں ہیں کہ تصور دیا جارہا ہے کہ جیسے جی میں آئے اسے پڑھ لیا جائے؟ اس تناظر میں اب اور تب کی پھر بحث ہی نہیں رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تب اس کی اجازت تھی نہ اب اس کے متعلق سوچا جاسکتا ہے۔ یہ ہمارے ایمان کی مضبوط ترین اساس ہے کہ قرآن مجید میں تغیّر ممکن نہیں ہے۔ ختمِ نبوت کے کُل معارف اسی ایک لطیف نکتے میں تو پوشیدہ ہیں۔ اللہ نے خود جو نعمت ہم پر تمام کی ہے وہ یہی تو ہے کہ اس کی نازل فرمودہ آخری کتاب سدا اپنے حقیقی متن کے ساتھ برقرار رہے گی۔ ابتدا سے انتہا تک اس میں کسی بھی تبدیلی کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے ہی فرض کرلیا جائے کہ قرآنِ مجید وقتِ نزول کسی اور صورت میں تھا تو ساری عمارت آنِ واحد میں زمیں بوس ہوجاتی ہے۔ اگر ایک گھڑی کے لیے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ قرآن شریف کی بعض آیات منسوخ ہوچکی ہیں تو اس کے اعتبار کا تقدس پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہوگا کہ خیر سے اِنسان یہ تعیّن کریں گے کہ اس کتابِ عظیم کی فلاں فلاں آیت منسوخ ہے۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ منسوخ آیات پر اِنسان آج تک متفق نہیں ہوسکے۔ ایک کسی آیت کو منسوخ کہتا ہے تو دوسرا کسی کو۔ کیا کریں بار بار وہی بات کرنا پڑتی ہے اور سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ قرآن میں خود خدا کہے کہ میں اس کا محافظ ہوں۔ اور روایت یہ کہے کہ آخری دو سورتیں (معوذتین) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک قرآن کا حصہ نہیں تھیں۔ انہیں خوفِ خدا ہے نہ رسولؐ کی محبت ان کے دِل میں موجود ہے اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا سچا احترام ہی ان کے ذہن میں ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضورؐ کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قرآن کے نسخوں میں درج ان سورتوں کو کھرچ دیا کرتے تھے؟

سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پیارے ساتھی پر یہ صریح تہمت ہے۔ اگر بالفرض کسی روایت میں ایسی کوئی بات موجود بھی ہے تو ہم اسے دشمنوں کی سازش قرار دیتے ہیں اور اس طرح کی کسی روایت کی ہماری نظر میں پرکاہ سے بھی زیادہ وقعت نہیں ہے۔ اِقرآن ہر شک سے بالا ہے، نبیؐ کی عصمت ہر شبہے سے بلند ہے۔ صحابہؓ کی عظمت ہر طرح سے مسلّمہ ہے۔ ان ابواب میں اگر شکوک کی چیونٹیاں دماغ میں رینگ رہی ہیں تو اپنے ایمان کا نئے سرے سے جائزہ لینا انتہائی ناگزیر ہے۔

انتہائی افسوس کا تو یہ مقام ہے کہ ہمارے لوگ اپنے وجود کے بُت خانے کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے اردگرد کعبے ایسی پُر

شکوہ عمارت بڑی ہنرمندی سے تعمیر کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس پر تاویلات کے تانے بانے سے تیار کیا ہوا سیاہ غلاف بڑے اہتمام سے اوڑھاتے ہیں۔ بعدازاں غیر قرآنی تصورات کو مقدس تحفظ فراہم کرنے کے لیے ''طُرق واسانید'' کے پوتر عنوان سے سفید براق احرام بندھوا کر خانہ ساز راویوں کے جیوش کو ہر دم مصروفِ طواف دکھاتے ہیں۔[۲] یہ خالص چمتکار ہے!

مقامِ تاسّف ہے کہ ہمارے ان لوگوں کو کیا کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ یومِ قیامت بہرطور اپنے ربّ کے حضور حاضر ہونا ہے؟ اور میدانِ حشر میں حضورِ پُرنور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بھی موجود ہوں گے۔ ان عظیم ہستیوں کا کیسے سامنا کریں گے؟ جب انہوں نے یہ استفسار کیا کہ ہمارے قرآن کو تم لوگوں نے مشتبہ کیوں بنا دیا تھا؟ تو ہمارے یہ محترم کیا وضاحت کریں گے؟ خدارا! ڈریے اس وقت سے کہ آنکھ بند ہوتے ہی قیامت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱ قرآن مجید کو مشتبہ قرار دینے میں خانہ ساز روایات نے کس قدر ظالمانہ کردار ادا کیا ہے۔ بطور نمونہ ''اُصولِ کافی'' کی اس روایت کا مطالعہ کافی ہوگا:
(حضرت امام جعفر صادق علیہ الرحمہ نے فرمایا) تم اس قرأت سے باز آجاؤ اور اسی طرح پڑھو جس طرح سب لوگ پڑھتے ہیں تا آنکہ قائم (امام مہدی) ظاہر نہ ہو جائیں۔ جب قائم (بارہویں امام) آجائیں گے تو کتاب اللہ کو اصل قرأت سے پڑھیں گے اور اس مصحف کو حضرت علیؓ نے جبکہ وہ اس کو لکھ کر فارغ ہوئے لوگوں کے سامنے نکال کر پیش کیا تھا اور فرمایا کہ: یہ ہے اللہ کی کتاب جو اس نے محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر اسی طرح نازل فرمائی تھی۔ اور اسے میں نے دولوحوں سے لے کر یکجا کیا ہے مگر لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس تو جامع مصحف موجود ہے جس میں قرآن لکھا ہوا ہے۔ ہمیں (آپ کے) اس مصحف کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اچھا تو خدا کی قسم تم اب ابد تک اسے کبھی نہ دیکھو گے! میرا تو یہ فرض تھا کہ جب میں نے اِسے جمع کر لیا تو تمہیں بتا دوں تا کہ تم اسی کو پڑھو۔''

(بحوالہ ''رفقائے نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم''، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی ندویؒ، ص 177-178)

اس روایت کی ایک ایک سطر شہادت دے رہی ہے کہ کسی غیر نے اپنے مذموم مقاصد کی خاطر اسے گھڑا ہے۔ معتبر تر اکابرین اسلام اور اللہ کی کتاب کو مشکوک قرار دینے کی یقیناً یہ عیارانہ مساعی ہے وگرنہ رفیقِ رسولؐ حضرت علیؓ جیسا عظیم جری اور مردِ حق محض چند لوگوں کے DENY کر دینے سے ''حقیقی قرآن'' کو قیامت تک کے لیے غائب نہیں کر سکتا تھا۔

اسی طرح یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ سیّدنا علی مرتضیٰؓ تو اس ردّعمل میں اس خصوصی مصحف کو ابد تک کے لیے غائب کر ڈالیں اور سیّدنا امام جعفر صادقؒ اس قیمتی نسخے کے بارہویں امام (امام مہدی) کے ظہور کے ساتھ منظرِ عام پر آنے کی بشارت سنا ڈالیں اور پھر اس کی غیوبت نا قابلِ فہم ہے کہ جن صاحب کو امام جعفر صادقؒ روک رہے ہیں وہ غائب قرآن ان کے پاس موجود ہے۔ ایک طرف ابد تک کے لیے غائب، دوسری جانب اس قاری کے قبضے میں موجود۔ اسے کہتے ہیں حیرت کی فراوانی!!!
(تفصیل کے مشتاق مولانا پھلواروی مرحوم کی تحریر کردہ نہایت عمدہ جرح وتعدیل محولہ تصنیف کے اوراق میں ملاحظہ کر سکتے ہیں)۔

۲ **انتہائی ضروری وضاحت**

حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ اقدس سے منسوب کسی وضعی سے وضعی اور ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی مسترد کرنا ایک سچے مسلمان کے لیے بڑا ہی کڑا امتحان ہے۔ وہ سو بار سوچتا ہے کہیں واقعی یہ فرمانِ رسولؐ ہی نہ ہو۔ یوں عجلت میں وہ اپنے نبیؐ کے ارشاد مبارک کا تارک ہو کر اپنا کُل ایمانی اثاثہ اکارت نہ کر بیٹھے۔ صاحبو! نسبت کوئی معمولی حوالہ نہیں ہے۔ لیکن معروضی حقائق، آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے تقدس اور قرآن مجید میں بیان فرمودہ معیارِ صداقت پر اگر وہ روایت کسی بھی طرح پوری نہ اترتی ہو تو (پھر بھی) جی پر جبر کر کے ہی اسے ناقابلِ قبول قرار دینا پڑتا ہے۔ کیا کیا جائے حبّ نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اپنے تقاضے ہیں۔
اس صراحت کے تناظر میں صحیح احادیث رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی معنویت اور اہمیت اپنے آپ اُبھر آتی ہے کہ آپؐ کے یقینی فرمودات دین کی مسلّمہ اساس ہیں۔ البتہ آپؐ سے جُڑی ہوئی جعلی روایات کو کسی بھی طرح سینے سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اور اس سلسلہ میں خود آپؐ نے دوٹوک الفاظ میں اپنی اُمت کی رہنمائی فرما دی ہے:
''میرے بعد تم سے بڑی کثرت سے حدیثیں بیان کی جائیں گی لہٰذا میری کوئی حدیث تم سے روایت کی جائے تو اُسے قرآن کے سامنے پیش کرو پھر جو اُس کے مطابق ہو اُسے قبول کرو اور جو اُس کے خلاف ہو اُسے رَد کر دو۔'' (مسند احمد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''**قرآن فہمی اور باغبانی**'' ہے۔عصرِ حاضر میں مسلمانوں میں وحدت قیادت نہ ہونے کے سبب اغیار ہمیں جدا جدا کر کے مار رہے ہیں۔ باغبان ایسوسی ایشن نے فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں میں وحدت اقتدار (خلافت) کے سلسلہ میں مقابلہ مضمون نویسی کا انعقاد کیا جائے۔اس سلسلے میں کچھ اشتہار پہلے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔مقابلہ مضمون نویسی کا عنوان:

## ﴿قیام خلافت کی راہ میں کون حائل ہے﴾

اس مقابلہ میں مضمون کا پہلا حصہ فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں اور دوسرا حصہ حالات حاضرہ کی روشنی میں ہونا چاہئے جو کہ 5 صفحات سے کم نہ ہو۔مضمون کے لئے یہ شرط بھی ہوگی کہ وہ پہلے قومی پریس میں شائع ہو چکا ہو۔اس سے یہ فکری تحریک اور تیز ہوگی۔ پہلا انعام ایک ہزار روپے نقد اور دوسرا انعام 800 روپے ہوگا۔ایک عام 5 سطری تجویز جو جامع اور مؤثر ہو اس پر 500 روپے انعام دیا جائے گا۔شائع شدہ مضامین کی درجہ بندی کے لئے ججز پینل تشکیل دے دیا گیا ہے۔یہ تمام حضرات باغبان ایسوسی ایشن کے تاحیات ممبر ہیں۔

(1) ملک عبدالمسجود ایم۔اے۔بی۔ایڈ مری (2) ملک فضل عالم بی۔اے راولپنڈی

(3) راجہ محمد صغیر ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی قانونی مشیر مری (4) محمد اشفاق عباسی ایم۔فل مری۔

**شائع شدہ مضامین وصول کرنے کی آخری تاریخ مع فوٹو سٹیٹ شناختی کارڈ 15 دسمبر 2009ء مقرر ہے۔اگر کوئی معیاری مضمون شائع ہونے سے رہ جائے تو بھی غیر شائع شدہ صورت میں قبول کر لیا جائے گا۔**

**تقسیم انعامات 25 دسمبر 2009ء کو ہوگی۔**

☆☆☆☆☆☆☆

**پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیداں نیو مری۔**

**(2) صبینہ یاسمین سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن ٹبی سیداں سوہاوہ جہلم۔**

**(3) تنویر صادق نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن مکان نمبر 6/18 گلی نمبر 1 میاں چنوں خانیوال۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق' اسلام آباد

# نقد ونظر

محترم عبدالستار غوری' ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری کی تصنیف اکلوتا فرزند ذبیح اسحاقؑ یا اسماعیلؑ کا اردو ترجمہ از عثمان سبحان غوری' ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری اور نظر ثانی اردو ترجمہ عبدالستار غوری' ناشر: المورد' طبع اول مئی 2009ء پر تبصرہ کرنے کی فرمائش موصول ہوئی ہے۔ مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ اس موضوع پر مکمل کتاب کی شکل میں شائع کرنے کی ترغیب' انہی کے ادارہ المورد کے سرپرست اعلیٰ جناب جاوید احمد غامدی نے دی۔

مصنف نے اپنی تحقیق میں بہت محنت کی ہے اور اس ضمن میں عیسائیوں کے مستند لٹریچر سے بھی بہت مواد اکٹھا کیا ہے۔ اس مواد پر مبنی دلائل سے انہوں نے ہر ایک کے نقطہ نگاہ کو مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ تعارف کے آخری پیرے میں سورہ صافات (102:37) کے حوالے سے البتہ اکلوتے بیٹے کے ذبیح کے عمل کو محض ایک خواب قرار دیا ہے نہ کہ ایک واقعی حقیقت' اس خواب سے ثابت یہی کرنا مقصود ٹھہرایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بلا تامل فرمان الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کر کے بیٹے کی قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔

طلوع اسلام کا اس ضمن میں موقف بڑا واضح ہے کہ: قرآن کریم نے اسے فرمان الٰہی بذریعہ وحی نازل کرنے کا ذکر نہیں کیا' البتہ حضرت ابراہیمؑ کے اپنے خواب کو سچ کر دکھانے کا عمل بتایا ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ ایک ٹی وی مذاکرہ میں محترم جاوید احمد غامدی نے اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انبیاء کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ انہوں نے البتہ اپنے اس دعویٰ کے حق میں کسی سند کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس سے مجھے میرے موقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی۔ قرآن سے جو ہمیں خدا کا تصور حاصل ہوتا ہے' اس کی رو سے جب تک کہ قرآن خود ہی وضاحت کرے اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا اللہ کا فرمان جاری کرنا خدا کے قرآنی تصور سے مطابقت نہیں رکھتا۔ خدا کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ انسانوں کی قربانی کا حکم دے گا' بڑی زیادتی ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ مصنف کو جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے اس موضوع پر اس قدر بھرپور انداز سے تحقیق کرنے کی ترغیب کس مقصد کے لئے دی۔ ذبیح اسحقؑ یا اسماعیلؑ دونوں میں سے کوئی بھی ہو' دونوں ہی حضرت ابراہیمؑ کے فرزند تھے۔

قرآن کریم نے ''ذبح عظیم'' کے جس مقصد کا ذکر کیا ہے' وہ مقصد اس تعین کے بغیر بھی حاصل ہوتا ہے کہ اس سے کونسی شخصیت مراد ہے۔

مصنف نے کتاب کے صفحہ 111 میں مولانا امین اصلاحی کے حوالہ سے ذبح عظیم کے مقصد پر یوں روشنی ڈالی ہے کہ: فرمایا: (اللہ نے) کہ ہم نے ابراہیمؑ کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑالیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس بیٹے کی جگہ ایک مینڈھے کو قربان کر دیں اور یہ قربانی ایک عظیم قربانی کی شکل میں ہمیشہ ہمیش آئندہ نسلوں میں اس واقعہ کی یادگار کی حیثیت سے باقی رہے گی۔''

تعارف میں تو بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم خدا کی طرف منسوب کیا اور یہاں بیٹے کی جگہ مینڈھے کی ذبح عظیم کو اللہ کا فرمان ٹھہرایا۔

ہم نے اس ضمن میں خدا کی طرف سے مینڈھے کی قربانی کے حکم کو قرآن کریم سے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی' لیکن چونکہ ایسا حکم قرآن میں ہے ہی نہیں' اس لئے دستیاب نہیں ہو سکا۔ اگر مصنف اس ہدایت کے حوالہ میں قرآن کی متعلقہ آیات کا حوالہ دے دیتے تو ہمارے لئے آسانی رہتی۔ ورنہ بظاہر منطقی طور پر تو بیٹے کی قربانی کی جگہ مینڈھے کی قربانی عظیم کی بجائے پست سطح کی محسوس ہوتی ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق ایسا ذکر تحریف شدہ الہامی کتاب تورات کے حوالے سے ہماری کتب روایات میں پایا جاتا ہے لیکن طلوع اسلام کا موقف ہے کہ اللہ کی طرف سے حکم منسوب کرنے کے لئے قرآن کی سند لانا لازمی ہے۔ اگر ایسی سند موجود نہ ہو' تو اس کو اللہ کا فرمان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قرآن کریم میں تو بیٹے (حضرت اسماعیلؑ) کو چھڑی سے بچایا' اس لئے بیٹے کو ''ذبح اللہ'' سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہو گا۔ اللہ نے تو ان کو ذبح ہونے سے بچایا اور حکم دیا کہ مکہ کی بے برگ وگیاہ وادی میں ''ہمارا گھر'' بناؤ اور بیٹے (حصرت اسماعیلؑ) کو اس کی پاسبانی کے لئے وقف کر دو۔ آپ غور کیجئے۔ سرزمین شام کی شادابیوں کی جگہ صحرائے عرب کا مسکن' اور منصب سرداری اور حکمرانی کے بجائے عبادت گاہ کی تولیت' یہ تھی وہ بڑی قربانی (ذبح عظیم) جس کے لئے حضرت اسماعیلؑ کو چھڑایا گیا تھا۔ وہ قربانی جسے ایک لمحہ میں ختم نہیں ہو جانا تھا بلکہ ساری عمر اور وہ بھی پشتوں تک ساتھ رہنا تھا۔ یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی جس کے اثرات صدیوں تک تولیت کعبہ کی شکل میں متوارث آگے بڑھتے رہے۔ اس کے بعد مصنف کو خود سوچنا چاہئے کہ ''ذبح عظیم'' سے مراد بھیڑوں' بکریوں کی قربانی لینا' قرآنی عظمتوں کو کن پستیوں تک لے جانا ہے۔

آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ غامدی صاحب کا مشورہ اپنی جگہ' ہمیں امید ہے کہ مصنف اپنی تحقیق کا رخ دوسری سمت بھی مبذول کر کے اپنی کاوشوں سے امت کی راہنمائی کریں گے۔ آپ نے بہت محنت سے کام لیا ہے لیکن مقصد پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شگفتہ طاہر' کراچی

# دِیا جلائے رکھنا ہے

ماں دنیا کی عظیم ہستی ہے جس کی محبت وشفقت سے یہ دنیا پرنور ہے بےلوث خدمت کا بحر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں ہے وہ موج ہے جس میں طغیانی نہیں وہ سکوت ہے جس کے بعد پریشانی نہیں ہے۔ جذبۂ محبت جس کو مامتا بھی کہا جاتا ہے ہر ذی روح کو عطا ہوئی ہے لہٰذا اس کا چرند' پرند' حتیٰ کہ درندوں اور موذی جانوروں تک میں اپنی اولاد سے بےغرض و بےلوث اظہار محبت بَرملا نظر آتا ہے۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟ کیا دنیا کا کام اس شدید جذبے کے بغیر ناممکن تھا؟ یقیناً اللہ تعالیٰ نے کائنات بے وجہ' بلاضرورت' صرف کھیل کود کے لئے نہیں پیدا کی' اس کا ایک خاص مقصد ہے اور ایک اہم اسکیم ہے۔ جو اس کارخانے کو عدم سے وجود میں لانے کے بعد سے آج تک اربوں سالوں سے سرگرم عمل ہے۔ اس کی انتہا کو قیامت یا روز آخر سے قرآن تعبیر کرتا ہے۔ جس میں پھر سے جی اٹھنے کا عمل اور حساب وکتاب شامل ہیں۔

فی الوقت ہم پندرھویں صدی کی جس دہائی سے گزر رہے ہیں اُس لمحے یا اُس پل تک انسانوں کی ترقی وعظمت کی کافی داستانیں صفحہ قرطاس پر پھیل چکی ہیں ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات سے انسانی ذہن کی ''انشاء پردازیاں'' دیکھ سکتے ہیں۔ ایٹم کا سینہ چیر کے اس سے توانائی کے ذخائر حاصل کر کے زندگی کی رفتار کو کئی ہزار میل فی گھنٹہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ تو دوسری جانب وہ کئی بے گناہ ومعصوم زندگیاں آن کی آن میں نیست ونابود بھی کرسکتا ہے۔ عروج وزوال کی اس داستان میں وہ بنیادی ضرورت جس کو زندگی ترستی ہے وہ جذبۂ مامتا آج بھی اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا کل تھا۔ کیا ہم نے ماؤں کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی حفاظت کے لیے بھی کبھی سوچا ہے؟

میڈیکل سائنس نے بھی اپنے عروج کا زمانہ دیکھنا شروع کر دیا جب دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک نے سر جوڑ کر اس مسئلے پر غور کیا کہ زچگی کے دوران ماؤں کی شرح اموات زیادہ ہونے کی وجہ سے بچے دنیا میں اس نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں ان کی پرورش (جس کے لئے مخصوص قسم کے ''غیر محسوس تار'' اس بچے کے درمیان ہوتے ہیں) وہ نہ ہونے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا ہے لہٰذا 1952ء میں پہلی دفعہ انگلینڈ اور wales ویلز میں ایک

انکوائری شروع کی جس کے تحت اس شفیق ہستی کو بچانے کے لئے تدابیر کی جاسکیں۔ وہ رپورٹ ہر تین سال کے وقفہ سے جاری کی جاتی ہے ان کے ساتھ ہی دوسرے ممالک آئرلینڈ نے 1956ء اور سکاٹ لینڈ نے 1965ء میں یہ انکوائری شروع کیں۔ ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد اس دہائی میں پہنچ کر انہوں نے اپنے شعبہ صحت میں جو ترقی کی منازل طے کیں اس کے تحت علاج و معالجہ کی سہولتیں بلا تخصیص نسل، قومیت و زبان رائج کر دیں۔

ترقی یافتہ ممالک جن مشکلات پر قابو پانے کے بعد آج جس منزل کی طرف رواں دواں ہیں ہم اس قافلے کی اڑتی ہوئی گرد بھی نہیں دیکھ پاتے۔ وہ ہم سے کوسوں میل آگے نکل چکے ہیں اور خدائی پروگرام سے اپنا نصب العین منطبق کرنے کے بعد عملی میدان میں صحیح معنوں میں نظام قدرت کے مددگار اور حامی ہیں۔ گو کہ ان میں کوئی مسلمان نہ ہو لیکن اس میدان میں، جزواً وہ سب اسلام کے ہی پیروکار ہیں۔

اسلام الدین ہے کوئی مذہب نہیں جس میں انفرادی ذات، کی ترقی ہی منزل مقصود ہو یہاں کوئی موج بیرون دریا ہو ہی نہیں سکتی۔ شخصیت پرستی کی سختی سے ممانعت کرتا ہے اور یوں ذات پات، رنگ و نسل، حیثیت و مرتبہ، جاہ وجلال، اقتدار، لسانیت کے بتوں کو ریزہ ریزہ کرتا ہے کہ اس میں نہ کوئی بندہ ہوتا ہے اور نہ بندہ نواز!!

ناظرین ہم جس موضوع پر آج قلم اٹھا رہے ہیں وہ ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ شعبہ تعلیم ہو یا صحت دونوں سے قوموں کی زندگی کی ڈور بندھی ہے۔ صرف تعلیم یافتہ قوم ہی باوقار مستقبل کا خواب دیکھ سکتی ہے پاکستان میں تعلیم بدقسمتی سے صرف 40 فیصد اور صحت کا اندازہ وشمار ناممکن ہے کیونکہ ہمارے یہاں نظام حکومت میں اس شعبے کا بجٹ ہی نپا تلا ہوتا ہے۔ اس قسم کے ادارے جو کہ ملک بھر سے مسائل کی انکوائری کر کے رپورٹ بنائیں اور حتمی شکل دینے کے لئے حکومت وقت کے ساتھ مل کر ان مسائل کو حل کریں ناممکنات میں سے ہے۔ جس جنتی معاشرے کے قیام کی بات قرآن کرتا ہے وہ تو اسی دنیا میں رہتے ہوئے نظام حیات ایسا عطا کرتا ہے جس کے تحت فلاحی مملکت قائم ہوسکتی ہے جس میں ہر انسان آسانی سے اپنے لئے متاع حیات حاصل کرسکتا ہے۔ قرآن کے تحت عمل میں لائی جانے والی مملکت کا سربراہ کوئی بادشاہ نہیں ہوسکتا وہ خادمِ انسانیت کہلاتا ہے۔ حکومت صرف قانون خداوندی کی ہوتی ہے اس پروگرام کو عملی جامہ جماعت المومنین پہناتی ہے۔ اس نظام کے اثرات تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں جا بہ جا!! چشم بینا و دل بسمل چاہئے ان سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے۔

پاکستان میں ماؤں اور بچوں کی شرح اموات میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ حال ہی میں عالمی ادارہ صحت نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس کے تحت تقریباً 600,000 مائیں۔ ہر سال دنیا بھر میں دوران زچگی اپنی زندگیوں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ جس میں سے زیادہ تعداد غیر ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ چند مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ادارہ

صحت اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ ان ممالک میں تعلیم کی کمی' صحت کی مناسب سہولیات کے بروقت موجود نہ ہونے یا ملکی حالات' سڑکیں' ذرائع نقل وحرکت کے مناسب وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے' مشکلات ہیں۔ جن غریب ممالک کا تذکرہ وہ افسوس ناک طریقے سے کرتے ہیں اکثر ان میں وہ مسلم ممالک ہیں جن کو قدرت نے بیش بہا ارضی خزائن سے نواز رکھا ہے۔جن کے مسائل' وسائل کو بروئے کار لاکر اپنی مدد آپ نہ کرنے کی وجہ سے خوفناک حد تک بڑھ چکے ہیں۔ پاکستان کی معیشت اور ترقی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وسائل اور نا قابل شکست مسائل کا کتنا عظیم دنگل برپا ہے۔جس عفریت کے قدموں تلے انسانیت سسک رہی ہے اور جو ہر آن اس کو ہڑپ کرنے کے درپے ہے۔

پاکستان جو ایک نظریاتی مملکت ہے جس کے قیام کی خاص وجہ جس سے کچھ متحارب قوتیں متفق جب بھی نہیں ہوسکیں آج بھی نہیں ہے مگر ان کی بنیادوں پر کاری ضرب لگانے میں مصروف عمل ہیں۔ نتیجتاً پندرہ کروڑ عوام کا اژدھام ہر سمت بکھرا ہوا ہے۔جس قوم کا نصب العین ہی متفق علیہ نہ ہو وہ کس قسم کے حالات سے دوچار ہوسکتی ہے۔ روز وشب بدلتی صورت حال سے ہم سب بخوبی آگاہ ہیں۔

قارئین کرام! کیا ایک لمحے کے لئے بھی ہم اپنی کوتاہ بینی سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں؟ شاید نہیں! ہم میں سے ہر شخص مصر ہے کہ اس میں میرا کیا قصور!!

اگر کسی گاؤں کے کچے مکان میں آٹھ بچوں کی ماں یا شہر کی کسی بستی کے کسی گھر میں کوئی ماں موت کا شکار ہوتی ہے تو ایک عام جملہ ہر شخص کی زبان پر آتا ہے۔اللہ کی مرضی' اس کی موت ہی یوں لکھی تھی۔کیا کرسکتے ہیں۔علاج تو بہت کیا مگر موت تو آنی ہی ہے لہٰذا اسے کوئی روک تو نہیں سکتا یہ سوچ کس قسم کے رویے کی غماز ہے۔یعنی ہم کیا کرسکتے ہیں خدا کی مرضی! بے بسی و بے یارومددگاری' تنہائی و بے کسی بے بسی وغیرہ وغیرہ کے غیر انسانی جذبات نظر آتے ہیں۔

میرا واسطہ بلواسطہ زچہ وبچہ کے امراض اور ان کے علاج سے ہے حال ہی میں ایک مولوی صاحب کی بیگم صاحبہ چودھویں بچے کے ضائع ہونے کی وجہ سے میری ایمرجنسی میں آئی تو ڈاکٹرز نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کی صحت اور باقی بچوں کے لئے ضروری ہے کہ آپ بچے بند کروالیں یا پھر وقفہ ہی کریں۔ان کا مدعا جاننے کے بعد کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اُسے مشورہ ہی دے سکتا۔ مریضہ کا مؤقف تھا کہ بچے اللہ کی نعمت ہیں وہ جب دے رہا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کہ منع کریں اس میں تو اگر عورت کو موت بھی آجائے تو وہ شہید کی موت ہے۔سیدھی جنت میں چلی جائے گی!!!

یہ وہ لوگ ہیں جو سینے پر بم باندھ کر انسانیت کا قتل عام کرتے ہوئے جنت میں چلے جاتے ہیں ان کا برین کس قدر واش کردیا جاتا ہے یہ تو کرنے والوں کا کمال ہے ماننا پڑے گا۔

تاج محل کی دلکشی ورعنائی کے چرچے ایک صدی

گزرنے کے بعد آج بھی سنائی دیتے ہیں جس ممتاز محل کو اُس بہترین آرٹ کے نمونے کی نذر کر دیا گیا اس کی موت پر کوئی ماتم کرنے والا نہیں تو سبق سیکھنے والا کیسے پیدا ہوسکتا ہے!!

اپنے اٹھارہویں بچے کی پیدائش پر ممتاز محل خون نہ رکنے کی وجہ سے اس دار فانی سے رخصت ہوئیں تو بادشاہ سلامت نے ملکہ عالیہ کے سوگ میں دن رات ایک کر کے دنیا بھر سے بہترین آرٹسٹ' کاریگر' ڈزائینز' انجینئر مدعو کئے اور اپنے ذوق کی تسکین کے لئے بیوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تاج محل تعمیر کر دیا جو کہ ایک شاہکار ہے۔ انہیں دنوں میں سویڈن کے فرمانروا کی بیوی کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہوگیا۔ اس نے ملک بھر سے ڈاکٹرز ہیلتھ کیئر سسٹم بہتر کرنے کے لئے کمیشن بنایا جو کہ ماؤں کی زچگی کے دوران یا اس سے متعلقہ بیماریوں کی وجہ سے موت کا شکار ہونے والی خواتین کا اندازہ لگائے جو کہ 900/100,000 زچگیوں میں تھیں۔ یہ رپورٹ 1751ء میں پہلی مرتبہ چھپی۔ یورپین دنیا میں بھی سب سے پہلے سویڈن نے مردم شماری اموات' شادیوں اور زچگیوں کے حساب کتاب کے لئے رجسٹر بنائے اور اعداد و شمار کر کے اپنی کمزوریوں کو سمجھا اور ان کے تدارک کے لئے ہر ممکن اقدامات کئے گئے جو کہ دو صدیوں پر محیط ہیں۔ ان اقدامات میں سب سے پہلے بہتر' ٹرینڈ مڈوائفری سسٹم شہروں' دیہاتوں اور دور دراز کے علاقوں میں متعین کیا۔ اس سسٹم میں مڈوائف' ڈاکٹر اور ہسپتال شانہ بہ شانہ کام کر رہے تھے۔ انیسویں صدی تک آتے آتے یہ شرح اموات 230/100,000 رپورٹ کی گئی جو کہ 1751ء سے 1900ء تک محیط تھی۔ آج بیسویں صدی میں سویڈن کی ماؤں کی شرح اموات 3/100,000 ہے جو کہ بہترین' جدید ترین' میٹرنٹی سروسز کو ظاہر کرتی ہیں۔ بلا امتیاز رنگ و نسل' امیر و غریب' شہر و دیہی علاقہ جات تمام خواتین کو یکساں طور پر ہیلتھ سروسز مہیا کرنا یقیناً قرآنی نظام ربوبیت کی ایک خصوصیت ہے۔ چاہے وہ عقیدہ کے اعتبار سے کسی بھی مقام پر ہوں مگر عملی میدان میں وہ رب کائنات کے بنائے ہوئے اصولوں کے تابع ہیں۔ انسانیت کی منفعت کے لئے کوشاں برصغیر میں ماؤں کی شرح اموات آج بھی 400,450/100,000 زچگیوں میں ہے۔ یہ اعداد و شمار ہمارے ناقص ہیلتھ کیئر سسٹم کو ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں لوگوں میں لاعلمی اور لاپروائی ایک عنصر عام ہے وہاں ہیلتھ کیئر سسٹم میں بھی ناہمواریاں و ناقص انتظامات ایک اہم وجہ ہیں۔

انسانی حقوق کی علمبردار کافی تنظیمیں ماؤں کی صحت کے لئے فکرمند رہتی ہیں لیکن کسی سسٹم کے تحت ایک منظّم طریقے سے حکومتی سطح پر زچہ و بچہ کی صحت کے لئے انتظام اور کوششوں میں فقدان ہے۔ جس نظام میں انسانی زندگی کی کوئی وقعت باقی نہ رہے اس نظام کے تحت بننے والے معاشرے میں لوگ جس زندگی کو گزارتے ہیں اس کو قرآن جحیم کہتا ہے۔ لفظ جحیم' جہنم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے لفظی معنی تو رکے ہوئے ہونا ہے۔ جہاں ترقی

کی راہیں مسدود ہوکر رہ جائیں۔ انسانوں کی آزادی افکار چھین لی جائے۔ اس بے بس معاشرے کی زندگی ہی جہنمی زندگی ہے۔

دیکھئے! قرآن جس نظام کے تحت معاشرے کی تعمیر کرتا ہے وہاں ہر انسان کو اپنی پوری قوت' جوش و جذبے سے آگے بڑھنا ہے اور آسمانوں کی طرف اٹھنا بھی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ ہی جنتی زندگی کا خاصہ ہے جو چاہیں گے ملے گا۔ جتنا مانگو گے ملے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ نعمتیں جن کا ذکر قرآن کرتا ہے وہ اُخروی دنیا کے لئے ہی نہیں ہیں' بلکہ اس دنیا میں بھی انسانوں کی زندگیوں میں مسلسل ترقی تعمیر اور آگے بڑھتے چلے جانے کی جستجو اور نئی راہوں کی تلاش ہی تو جنت ہے!!

10 مئی 2009ء کو ہم نے ماؤں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ دن منایا یہ سوچ کر کہ شاید ہماری ماؤں کے درد کا بھی کوئی درماں ہوا کرے۔

دنیا میں بے لوث پیار کرنے والی اس ہستی کی قدر و قیمت کا اندازہ تو وہی لگا سکتا ہے جو اس نعمت سے محروم ہو جائے یا جس نے کبھی اس لمحہ کو پایا ہی نہ ہو۔ کتنے ہی نوزائیدہ بچے ہیں جن کی زندگیوں میں یہ بہار کبھی نہیں آئی جو اس وجود کی کمی کو ساری عمر محسوس کرتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی مکمل اور بے باک شخصیت کے حامل نہیں ہوتے۔ اے کاش کہ اہل زمانہ غور کریں۔ کبھی ان قیمتی جانوں کے نذرانوں پر تفکر کریں اور مثبت لائحہ عمل پہ کام کریں اس کام میں صرف حکومت ہی نہیں بلکہ ہر شخص جو کسی بھی حوالے سے کسی کے کام آسکے وہ اگر اپنی ذمہ داری کو نبھا دے تو یہ اعداد و شمار کم ہو سکتے ہیں۔ بروقت علاج کی سہولت' صحت و صفائی' اولاد میں مناسب وقفہ' غذا' صاف پانی' ماہرین امراض کی بروقت موجودگی' ادویات' خون کا انتظام' لیبارٹری سسٹم حتیٰ کہ ایمبولینس بمع ڈرائیور کی بروقت موجودگی بے انتہا ضروری ہے۔

شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

## محترم خریدارانِ طلوع اسلام!

آپ کو مجلّہ طلوع اسلام جب بذریعہ ڈاک موصول ہو تو براہِ کرم لفافہ کو پھینکنے سے پہلے اس کے اوپر اپنے زرِشرکت سے متعلق تحریر کو ضرور پڑھئے جس پر آپ کا خریداری نمبر اور جس مہینہ اور سال تک آپ نے زرِشرکت ادا کیا ہو' وہ مہینہ اور سال اس طرح لکھا ہوتا ہے:

Subscription Paid Up to 12/2008/Subscription Paid Up to 12/2009

اس طرح آپ کو ادا شدہ یا واجب الادا زرِشرکت سے متعلق ایک نظر ڈالنے پر معلوم ہوتا رہے گا۔ نیز زرِشرکت بھیجتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ ایڈریس کی تبدیلی کی صورت میں مہینہ کی 15 تاریخ تک ادارہ کو مطلع کیجئے تاکہ اس ماہ کا پرچہ آپ کے نئے پتہ پر ارسال کیا جا سکے۔ (ادارہ طلوع اسلام)

# عید مبارک

# جشن نزول قرآن مجید

پر

پیشگی ہدیہ تبریک قبول فرمائیے

## اے نوع انسانی!

تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطہ حیات آ گیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقف اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی راہنمائی، زندگی کی منزل مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامان نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسے ضابطہ حیات کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام ساز و سامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔

**(القرآن الکریم، یونس 10، آیت 58)**